پشاور یونیورسٹی کی اُن دنوں چونکہ اپنی کوئی علیحدہ سے مجلسِ طلباء نہیں تھی، لہذا ملک گیر سطح پر ہونے والی طلباء کی سرگرمیوں میں حصہ لینے کیلئے یونیورسٹی کی انتظامیہ نے تین طلباء پر مشتمل ایک پینل ترتیب دیا۔اس میں صدر خیبر یونین کے علاوہ لاء کالج اور شعبہ انگریزی کے ڈیبیٹنگ سوسائٹی کے صدر کو شامل کیا گیا۔اُن دنوں ملک بھر میں صرف نو عدد یونیورسٹیاں کام کر رہی تھیں۔لہذا لاہور میں منعقد ہونے والے ''ایسوسی ایشن آف سٹوڈنٹس یونینز آف یونیورسٹیز آف پاکستان (ASUUP)'' اور'' ورلڈ یونیورسٹیز سروس''(WUS) کے اجتماعات میں راقم الحروف کے علاوہ لاء کالج کے قاضی ہمایوں اور شعبہ انگریزی کے محسن صاحب نے پشاور یونیورسٹی کی نمائندگی کی۔آخرالذکر مجلس میں ہماری یونیورسٹی کے کئی دیگر طلباء بھی شریک تھے۔یہ اجتماعات دسمبر 1962 میں منعقد ہوئے اور مشرقی ومغربی پاکستان دونوں جانب سے نمائندہ طلباء وطالبات کو ایک دوسرے کو قریب سے دیکھنے، سمجھنے اور ایک دوسرے کی مشکلات سے کماحقہ آگاہ ہونے کا موقع فراہم ہوا۔اسی طرح مارچ 1963 میں نوجوانانِ پاکستان کے کنونشن منعقدہ لاہور میں راقم الحروف، ہمارے سیکرٹری جنرل عبدالرّسول امین اور گورنمنٹ کالج پشاور کی طلباء یونین کے صدر عبدالحمید خان آفریدی نے صوبہ سرحد کی نمائندگی کی۔آفریدی صاحب بعد میں پاکستان کی فارن سروس کے ایک فعال سفارت کار بنے۔دورِ طالب علمی کے ان بے شمار تجربوں نے دوسرے انسانوں کو سمجھنے اور اُن سے محبت واخوت کا رشتہ استوار کرنے میں مدد دی۔

یہاں میں باٹنی ڈیپارٹمنٹ کے ڈاکٹر فریدی کا ذکر کرنا چاہوں گا۔جن کی سرپرستی میں ہم نے ''عوام سے عوام تک''(People to People) پروگرام ترتیب دیا۔دوسری یونیورسٹیوں کی طرح ہمارے کالج اور یونیورسٹی میں بھی متعدد دوست ممالک کے طالب علم زیرِ تعلیم تھے۔یہ فورم مقامی طلباء اور دیارِ غیر سے آئے ہوئے طلباء کو قریب لانے اور ایک دوسرے کے رہن سہن، رسم ورواج اور طعام وکلام سے آگاہ ہونے میں مُمد ومعاون ثابت ہوا۔

اُسی سال طلباء کی ثقافتی سرگرمیوں کو جِلا دینے کیلئے خیبر یونین ہال کے عین سامنے بٹلر ہاسٹل اور لائبریری کے درمیان خالی قطعہ زمین پر ایک تفریحی مرکز کی عمارت کی بنیادیں رکھی گئیں اور فی الواقعہ چوہدری محمد علی صاحب کی سرکردگی میں راقم الحروف اور اُس کی کابینہ کے سب ہی ارکان نے کُھدال لے کر کُھدائی کی ابتداء کی۔

اقوام متحدہ اسلامیہ کالج میں

ایک اور واقعہ جس کی نشاندہی کرنا چاہوں گا۔وہ خیبر یونین کے زیرِ اہتمام اقوامِ متحدہ کی مجلسِ عمومی

(جنزل اسمبلی) کے اجلاس کا چربہ (mock session) اُتارنے کی کوشش تھی۔ چونکہ حفاظتی کونسل میں مستقل ممبران میں سے سوویٹ یونین وہ واحد طاقت تھی جو متواتر عالمی تنازعوں بشمول مسئلہ کشمیر پر بحث کے دوران اپنے حقِ تنسیخ (veto power) کا برابر استعمال کر رہی تھی، قرارداد زیرِ بحث یہ تھی کہ ''سُووِیٹ یونین کو اقوامِ متحدہ سے نکال دیا جائے'' اُن دنوں پاکستان کے وزیرِ خارجہ جناب ظفر اللہ خان مجلسِ اقوام کے صدر کے طور پر فرائض انجام دے رہے تھے اور اِدھر چربہ اجلاس میں قُرعہِ فال راقم کے نام نکلا۔ چربے کو حقیقت کا رنگ دینے کیلئے یہ کوشش کی گئی کہ مختلف مما لک کے نمائندے نہ صرف اچھے مقرر ہوں، بلکہ لباس اور رکھ رکھاؤ میں بھی اصل زُعماء کا مقابلہ کرسکیں۔ سب سے نمایاں اداکار مقرر بھارت، کیوبا، سری لنکا اور سوویٹ یونین کے رہے، جنہوں نے حقیقی معنوں میں اپنے رول سے انصاف کیا۔ بھارت کے آنجہانی وزیرِ خارجہ کرشنا مینن، جن کی مسئلہ کشمیر پر تقریر اپنی طوالت کے لحاظ سے ایک ریکارڈ تصور کی جاتی ہے، کی جگہ ڈاکٹر غلام اکبر نقوی نے لی۔ جنہوں نے اپنی تقریر کی ابتداء سنسکرت الفاظ میں چند مُقدس اَشلوک سُنا کر کی۔ کیوبا کے نوجوان وشعلہ نوا صدر فیڈَل کاسٹرو کا جادو جگانے کیلئے عبداللہ صاحب بالکل اُنہی کا چربہ بنے بیٹھے تھے۔ سری لنکا کی اُس دور کی وزیرِ اعظم مسز بندرانائیکا کا رول شعبہءِ سیاسیات کی ڈاکٹر مسز افسر سلیم نبھا رہی تھیں۔ اور سوویٹ یونین کی نمائندگی لاء کالج کے پروفیسر عبدالرزاق صاحب بہ حسن وخوبی نبھا رہے تھے۔ حسبِ توقع قرارداد بھاری اکثریت سے منظور ہوگئی۔ اجلاس کے اختتام پر شعبہ سیاسیات کی چیئرمین صاحبہ نے مجھ سے سوال کیا'' کہ کیا آپ واقعی پولیٹیکل سائنس کے طالبِ علم ہیں''؟ میرا جواب سُن کر کہ ''میں محض سائنس کا طالب علم ہوں'' وہ میری بات کا یقین کرنے سے قاصر تھیں۔ کہ بھلا اقوامِ متحدہ کے امور کا علم اور پھر انٹرنیشنل لاء کے امور کی تفصیلات سے مکمل آ گاہی کی صورت میں ایسا کیونکر ہوسکتا ہے۔ وہیں انہوں نے مجھے اپنے شعبہ میں داخل ہونیکی دعوت دی اور سچ تو یہ ہے کہ اُس دن سے میں بھی اس سلسلے میں سوچ میں پڑ گیا۔

ہماری خوش قسمتی سمجھئے کہ اُس سال ہم اپنے طلباء میں سے چند انتہائی ذہین اور منطقی انداز میں اپنا مؤقف پیش کرنے والے مقررین منتخب کرنے میں کامیاب رہے۔ اور کالج کی تاریخ میں اُس سال بین الکلیاتی مباحثوں میں ریکارڈ نمبر ٹرافیاں اسلامیہ کالج کے پاس آئیں۔ اس لاجواب کارکردگی کا کریڈٹ بِلا شبہ عبداللہ اور حیدر کرار (مستقبل کے نیّر زیدی جو بعد میں امریکہ منتقل ہوگئے اور بین الاقوامی صحافت میں اپنا مقام بنا گئے) اور حق نواز

دُرانی کو جاتا ہے۔حق نواز صاحب نہ صرف یہ کہ انتہائی اچھے مقرر تھے بلکہ بحیثیت طالب علم اُنہوں نے عِلم کی مختلف جہتوں میں اپنی انتھک محنت اور خُداداد فراست کے بل بوتے پر اپنا ایک خاص مقام بنایا۔ وہ بیک وقت ایک قانون شناس، معیشت دان اور بینکوں کے عمیق رموز سے آشنا انسان ثابت ہوئے۔1963ہی میں اسلامیہ کالج پشاور کا جشنِ زریں بڑے پُر وقار انداز میں منایا گیا۔کالج کے بے شمار سابقہ طالب علم اس میں مدعو تھے۔خود وائس چانسلر محمد علی صاحب کالج کے ابتدائی سالوں کے طالب علم رہ چکے تھے۔وہ اُس دور کے کئی دلچسپ واقعات سُنایا کرتے تھے۔اُس وقت کے صدرِ مملکت فیلڈ مارشل محمد ایوب خان نے اس تاریخی تقریب کی صدارت فرمائی۔ سابقہ طلباء اور کالج کے بہی خواہ کا اجلاس بعد میں میاں جعفر شاہ کی زیرِ صدارت منعقد ہوا۔چوہدری محمد علی صاحب کی زبانی ہم نے اسلامیہ کالج میں طلباء کے لیے ایک باقاعدہ رسمی لباس (یونیفارم) کے مروج کرنے کے پسِ پُشت مُحرکات کا قصہ سنُا۔ بقول اُن کے اِبتدا میں طلباء کمرۂ جماعت میں کوئی بھی لباس کسی بھی رنگ میں پہن کر آجایا کرتے تھے۔سردیوں کے دِنوں میں اکثر طالب علم کوئی چادر یا کمبل اوڑھے کلاس روم میں نظر آتے تھے۔ ایک روز سخت سردی تھی۔کالج کے انگریز پرنسپل اپنے معمول کے گشت پر ایک کمرے سے گذرے تو ایک طالب علم کو رضائی میں لپٹے ہوئے دیکھا۔اس حرکت پر سنجیدگی سے غور ہوا اور تب کار پردازان کالج نے باہم مشورے سے سیاہ شیروانی۔سفید کُلاہ پگڑی اور کالی چپل کا رسمی لباس رائج فرمایا۔

جشنِ زرین کے موقع پر فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی موجودگی میں چوہدری صاحب نے کالج کی تاریخ بیان کرتے ہوئے جب بانی کی حیثیت سے سر صاحبزادہ عبدالقیوم کی خدمات کا ذکر کیا تو ساتھ ہی فرمانے لگے کہ بعد میں اُن ہی کے ہم نام وزیرِ اعلیٰ سرحد خان عبدالقیوم خان نے پشاور یونیورسٹی قائم کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔اِس پر طلباء اور حاضرین نے پُر زور تالیاں بجائیں۔جو فیلڈ مارشل صاحب کی طبیعت پر خاصی گراں گذریں کیونکہ 1958ء کا مارشل لاء نہ لگتا تو پاکستان کی سیاسی قیادت خان عبدالقیوم خان کی سربراہی میں پاکستان مسلم لیگ کے ہاتھوں میں آنے کے واضح اِمکانات نظر آرہے تھے۔اکتوبر 1958ء میں اُن ہی کے جہلم میں 9 میل لمبے جلوس کے بعد ہی سیاست کی بساط اُلٹ دی گئی تھی۔چوہدری صاحب نے بعد ازاں اپنی تقریر میں سابقہ طلباء کالج میں جنرل محمد اعظم خان کا ذکر کیا جس پر ایک بار پھر حاضرین نے پُر داد تالیاں بجائیں۔فیلڈ مارشل صاحب تقریر فرمانے لگے تو طلباء نے اُس دور میں تعلیمی اداروں میں رائج کردہ سماجی خدمات (سوشل ورک) کی لازمی

حیثیت کو ختم کرنے کا مطالبہ کیا۔ اِس پر اُنہوں نے جواباً فرمایا۔ ''خدمت میں عظمت ہے۔ میں ساری عمر کام کرتا رہا ہوں۔ کیا میں کسی لحاظ سے بھی بُرا نظر آ رہا ہوں؟''

پشاور یونیورسٹی

پشاور یونیورسٹی کو اسلامیہ کالج کا مزید پھیلاؤ ہی شمار کیا جا سکتا ہے کیونکہ یہ اسلامیہ کالج کی خمیر سے ہی اُٹھی اور ترقی کی منازل طے کرتی رہی۔ دراصل اسلامیہ کالج کے قیام کے آٹھ سال بعد ہی حکومت کی ایک قائم کردہ کمیٹی نے 1921 میں شمال مغربی سرحدی صوبے اور ملحقہ قبائلی علاقے کیلئے ایک خود مختار یونیورسٹی قائم کرنیکی سفارش کی۔ [۳] بانی پاکستان نے 1948ء میں باقاعدہ طور پر ایسی ایک یونیورسٹی کی خواہش کا اظہار کیا اور پھر 1950ء میں پاکستان کے پہلے وزیر اعظم نوبزادہ لیاقت علی خان کے ہاتھوں اسلامیہ کالج کے بالمقابل ایک پُرانی عمارت میں اس یونیورسٹی کا سنگِ بنیاد رکھا گیا۔ دراصل موجودہ پشاور یونیورسٹی اُس جگہ آباد ہے جہاں ایک ہزار سال پہلے بدھ مت کے پیروکاروں نے کچھ ایسے ہی مقصد کیلئے اپنی ایک بڑی خانقاہ تعمیر کی تھی۔ اُس خانقاہ کے آثار پر آج پشاور یونیورسٹی کی پشتو اکیڈمی واقع ہے۔ اکیڈمی کی عمارت تو بعد میں تعمیر ہوئی۔ ہمارے وقت میں تو یہ آثارِ قدیمہ ابھی قائم و دائم تھے۔

شعبہ سیاسیات (1963 سے 1965)

شعبہ سیاسیات کی صدر نشین ڈاکٹر مسز افسر سلیم خان کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی میں کالج سے گریجوئشن کرنے کے بعد راقم نے اُنہی کے شعبہ میں داخلہ لیا۔ اس شعبہ کو قائم ہوئے ابھی ایک سال ہی گزرا تھا اور چونکہ کالج میں راقم الحروف نے پولیٹیکل سائنس کا مضمون نہیں پڑھا تھا لہٰذا داخلے کیلئے ایک تحریری امتحان کے مرحلے سے گزرنا پڑا۔ اور خُدا کے فضل سے اس امتحان میں سُرخرو ہوا۔ یہاں ہمیں انتہائی قابل اور جاندار اَساتذہ کی رہنمائی نصیب ہوئی۔ مسز سلیم خود علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے فارغ التحصیل تھیں اور انگلستان سے ڈاکٹوریٹ کر چکی تھیں اور ہمیں عوامی نظم و نسق (پبلک ایڈمنسٹریشن) کا مضمون پڑھاتی تھیں۔ ڈاکٹر راجہ محمد نائب تازہ تازہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ سے تشریف لائے تھے اور امریکی لہجے میں رنگے ہوئے تھے۔ بین الاقوامی امور کا مضمون پڑھاتے تو ساری کلاس کو مسحور کر دیتے تھے۔ ڈاکٹر ریاض صاحب تحریکِ پاکستان کے حوالے سے سیاسی

[۳] سَر ڈینیز برے اِنکوائری کمیٹی رپورٹ آن این۔ ڈبلیو۔ ایف۔ پی۔ 1922

اور آئینی اصلاحات کے تاریخی مدارج بیان فرماتے۔ مستقبل کے مشہور سفارت کار زاہد سعید صاحب بین الاقوامی قانون اور سفارت کاری کے رموز سمجھاتے۔ ایڈورڈز کالج کے پرنسپل اور مشہور ماہرِ سیاسی علوم ڈاکٹر فلپ ایڈمنڈ سیاسی فلسفہ کا درس دیتے۔ الغرض اچھے اور مُستند اَساتِذہ کی موجودگی نے اس نئے شعبے کو پشاور یونیورسٹی کا روحِ رواں بنا دیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ہمارے ایک بزرگ اُستاد جناب اسماعیل غزنوی کو جو پشاور کے ایک کہنہ مشق وکیل رہ چکے تھے، شعبہ سیاسیات نے اُن کی پیرانہ سالی کے باوجود ہر دم متحرک نوجوان نسل کیلئے کچھ عرصے تک تدریس پر مامور رکھ کر ہمارے صبر کا امتحان بھی لیا۔ بیچارے اپنے دندانِ مبارک کھو بیٹھے تھے اور انتہائی سکون و آرام سے لیکچر دیا کرتے تھے۔ اُن کی سہولت کیلئے اُنہیں بیک وقت دو پیریڈ دے دئے گئے تھے۔ پہلے پیریڈ میں تو وہ بمشکل طلباء کی حاضری لے پاتے تھے۔ مشہور یہ تھا کہ وہ ماضی کی مشہور فلموں کے نامور اَداکار شیام کے برادرِ بزرگ تھے۔ واضح رہے کہ پشاور شہر آج بھی بالی ووڈ کی کے کئی مشہور اداکاروں اور اداکاراؤں کی جنم بھومی کے طور پر مشہور رہے۔ دلیپ کمار (یوسف خان) راج کپور، شیام وغیرہ کے نام تو زبان زدِ عام ہیں۔

انعامِ خُداوندی

یونیورسٹی کا پہلا سال ہاسٹل نمبر 2 میں گزرا۔ جہاں بے شمار دوست بنائے اور نبھائے۔ انعام اللہ جان تو اپنی ذات میں ایک اِدارہ تھا۔ دوست اور دُشمن بنانے میں یکتائے روزگار تھا۔ علم کا حقیقی متلاشی اور علم سے لگاؤ رکھنے والوں سے بے انتہا محبت کرنے والا اور سب ایسے طلباء اور اَساتذہ کیلئے باہمی رابطے کے اسباب تلاش کرنیوالا شخص تھا۔ روز کسی نئی دریافت کا ذکرِ خیر لئے بیٹھا ہوتا تھا۔ کہیں پر کوئی خُداداد ذہانت کا دعویدار نظر آتا فوراً اُسکی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھاتا۔ اُس وقت تو وہ آثارِ قدیمہ (آرکیالوجی) کا طالب علم تھا۔ تواریخ میں تو وہ پہلے ہی ایم اے کر چکا تھا لیکن فلسفہ، نفسیات، عمرانیات، لسانیات اور علم الانسان (انتراپالوجی) سب ہی علوم کی کتابیں انتہائی انہماک سے پڑھتا تھا اور نوٹس لیتا رہتا تھا۔ ایک دن اسلامیہ کالج کی قدیم لائبریری کے مہتمم عبدالوحید شاہ صاحب سے سرِ راہ ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا۔ قبلہ انعام اللہ جان صاحب آپ کے ہاں کچھ زیادہ ہی نظر آنے لگے ہیں۔ فرمانے لگے ''ہاں بھئی کتابیں قلمی کرنا ہی تو اُسکا مرغوب مشغلہ ہے''۔ ایک روز انعام اللہ جان کو کیا سوجھی کہ اپنے میڈیکل کالج کے دو دوستوں کو اپنے ساتھ بٹھائے اُنکے ساتھ انتہائی عمیق گفتگو میں مگن رہے۔ یہ سلسلہ کئی دن چلتا رہا۔ اور ایک دن ہمارے پاس آ کر اپنی نئی تحقیق کے نتائج سے آگاہ

فرمانے لگے۔اعلان فرمایا کہ سُن لو۔ میں نے ڈارون کی تھیوری کہ ''انسان اصل میں بندر کی ارتقائی منزل ہے'' میں ترمیم کرلی ہے۔ حضرت انسان کا پیشرو صرف بندر نہیں ، بلکہ مختلف لوگ مختلف جانوروں کی اِرتقائی شکل ہیں۔ثبوت کیلئے دیکھ لیجئے (ڈاکٹر) لطیف کو جس نے گیدڑ سے اور (ڈاکٹر) گلروز جس نے بھینسے سے ترقی کر کے موجودہ شکل اختیار کی ہے۔ اِتفاق سے دونوں کے خدوخال اُنکے اس مفروضے پر دلالت کیلئے کافی تھے۔ دونوں حضرات نے یہ بات سُنی تو انعام اللہ جان صاحب کی شامت آگئی اور پھر جو ہونا تھا وہی ہوا۔حضرت اچھا کھاتے تھے اور جان بناتے تھے۔ایک دن ہم نے دیکھا کہ انعام صاحب لنگوٹا پہنے بدن پر تیل مَل رہے ہیں اور مُنہ میں بانسری دبائے ہوئے ہیں۔ہم نے اِس پہلوانی اور نے نوازی کی وجہ تسمیہ پوچھنے کی جسارت کی تو فرمانے لگے ''مجھ سے کیا پوچھتے ہو، افلاطون بھی تو یہی کچھ کرتا تھا، تب ہی تو فرماتے ہیں کہ اُنکا ''فِلا سفر کِنگ''، صحت مند جسم کا مالک صحیح الدماغ اور موسیقی کا دلدادہ ہوگا۔تب ہی تو اُسکی روح اور بدن کی ہم آہنگی برقرار رہیگی۔انعام اللہ جان کی بذلہ سنجی اور حاضر دماغی اپنی جگہ،لیکن علماء اور انٹلیکچو ل کی تلاش وجُستجو ،اُنکی حوصلہ افزائی اور قدردانی کا اُنکا اپنا انداز تھا۔ جامعہ پشاور کے اُس دور کے اکثر مستند اساتذۂ فن وکمال اور مستقبل کے اہلِ دانش دوستوں سے ہماری پہلی ملاقات اُن ہی کے توسط سے ہوئی۔ان میں مشہور محقق ڈاکٹر احمد حسن دانی ،فداء اللہ صحرائی، ڈاکٹر فرزند علی ، ڈاکٹر مغنی، جمیل قلندر، عبدالاحد بہار، (ڈاکٹر) منظور اور بے شمار دیگر حضرات شامل ہیں۔آخرالذکر ڈاکٹر منظور صاحب نے جیالوجی میں ڈاکٹوریٹ کیا، محکمہ کسٹم کے اعلیٰ ترین عہدوں پر رہے اور جنیوا (سوئٹزرلینڈ) میں عالمی تجارتی ادارے (WTO) میں سفیرِ پاکستان کے عہدے پر فائز ہوئے۔انعام اللہ جان صاحب جن دنوں اسلام آباد میں قائداعظم یونیورسٹی کے ایریا ریسرچ سنٹر سے منسلک تھے تو حسبِ معمول اور حسبِ عادت اسلام آباد ہوٹل میں منعقدہ ایک علمی تقریب میں شرکت کیلئے گئے جہاں مشہور دانشور پروفیسر پریشان خٹک بطور مہمانِ خصوصی مدعو تھے۔انعام اللہ جان صاحب کو دیکھ کر چند منتظمین حضرات آگے بڑھے۔ایک نے اُن سے بڑی معصومیت سے پوچھا '' آپ ہی پریشان خٹک ہیں؟'' انعام اللہ جان نے برجستہ جواب دیا۔ بھائی ''پریشان'' تو میں ہوں لیکن ''خٹک'' نہیں ہوں۔

اولین صدارتی انتخابات

یونیورسٹی میں داخلہ لیتے وقت اپنے تئیں ہم نے یہ مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ اب اپنا وقت محض حصول علم کے

لئے وقف کر دیں گے اور طلبا سیاست سے کنارہ کش رہیں گے۔ اس ارادے میں کسی حد تک کامیاب بھی رہے، لیکن شومئی قسمت اُس سال پاکستان کے مردِ آہن حکمران جناب فیلڈ مارشل ایوب خان صاحب نے اپنے وضع کردہ آئین کے تحت بنیادی جمہوری نظام کے ذریعے صدارتی انتخابات کرانے کی ٹھانی۔ اُن سے اختلاف رکھنے والی سیاسی جماعتوں نے اُن کے مقابلے میں متفقہ طور پر مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کو صدارتی اُمیدوار نامزد کر دیا۔ اور انتخابی جدوجہد زوروشور سے جاری ہوگئی۔ انتخابی ادارے کے اجلاس سلسلہ وار مختلف بڑے شہروں میں منعقد ہونے لگے جن سے سب صدارتی اُمیدوار باری باری خطاب کرتے تھے۔ ایسا ہی ایک جلسہ پشاور میں بھی ہوا۔ اُس روز سیاسی صورت حال کافی کشیدہ تھی۔ اُدھر یونیورسٹی کے ٹیچرز، سٹوڈنٹس سنٹر میں وائس چانسلر کی صدارت میں دس دسمبر کے عالمی یومِ حقوقِ انسان کے حوالے سے ایک تقریب منعقد ہو رہی تھی اور یونیورسٹی کے باہر حکومتی حفاظتی اقدام کے طور پر پولیس کی ایک بھاری نفری تعینات تھی۔ اُس وقت تک جامعہ کو ایک علمی درسگاہ کے طور پر ایک مقدس جگہ تصور کیا جاتا تھا جہاں پولیس کا سپاہی شاذ و نادِر ہی نظر آتا تھا۔ شعبہ سیاسیات کی چیئرمین صاحبہ نے مجھے دِن کی خصوصی مناسبت سے ایک مقالہ پیش کرنے کو کہا۔ اور میں نے بڑی محنت سے چند صفحات پر مشتمل مضمون تیار کر لیا۔ شہر کی مکدر سیاسی فضا کی خبر یونیورسٹی پہنچی تو طلباء اور پولیس کے درمیان بھی حالات بگڑنے میں دیر نہ لگی۔ مجھ سے پہلے مقرر لاء کالج کے سعید بیگ نے صدرِ پاکستان کے فلسفہء جمہوریت ''کنٹرولڈ ڈیموکریسی'' اور گُھٹن زدہ سیاسی ماحول کی طرف اشارہ کیا اور ساتھ ہی سامعین کی زبردست تالیوں میں ایک انتہائی متاثر کُن اور پُر جوش تقریر فرمادی۔ اُنہیں تو موقع پر ہی ''شیخ بمبار'' کا خطاب عنایت ہو گیا۔ جو مقرر موصوف کی باریش شخصیت اور شُعلہ بیان انداز کے ساتھ کافی جچا۔ اس تناظر میں جب سامعین کا موڈ خاصا جذباتی ہوگیا تھا، میری باری پر میرا اندازِ تخاطب بھی لامحالہ بدل گیا۔ حقوقِ انسانی کے تاریخی پس منظر کے بیان کے ساتھ ساتھ موجودہ حالات کا تقابلی جائزہ بھی پیش کرنا پڑا۔ بے پناہ تالیوں کی گونج میں جب وائس چانسلر صاحب نے تقریب ختم کرنے کا اعلان فرمایا تو ہال کے باہر نعرے لگاتے ہوئے طلباء کے مجمع پر پولیس کے آنسو گیس کے شیل گرنے لگے اور ساتھ ہی مظاہروں میں استعمال ہونے والے گُھڑسواروں نے یونیورسٹی کی سڑکوں پر یورش کر دی۔ ہاسٹل نمبر 2 اور جلسہ گاہ آمنے سامنے ہی تو تھے۔ درمیان میں صرف سڑک اور اتھلیٹیکس گراؤنڈ ہی تو حائل تھا۔ کسی نے آ کر اطلاع دی کہ دو ایک طلباء پولیس گُھڑسواروں کے قدموں تلے آ چکے ہیں۔

ان میں میرے چھوٹے بھائی چراغ صاحب بھی شامل ہیں۔ اس پر دو بنوچی طلباء سوداد خان اور خالق داد (عُرف کے۔ڈی) نے ہاسٹل کی چھت سے اس دستے پر فائرنگ کردی۔ میڈیکل کالج کے طلباء کی مدد سے کچھ مرہم پٹی کرنے کے بعد زخمی چراغ کو تو ساتھی طالب علم فوراً یونیورسٹی ہاسپٹل لے گئے کیونکہ شہر کے بڑے ہسپتال کی راہ میں تو پولیس کے دستے حائل تھے۔ کثیر تعداد میں طلباء ہمارے ہاسٹل کے سامنے جمع ہو گئے۔ مجھے اُن سے خطاب کرنے کی دعوت دی گئی۔ ابھی میں نے صبر کی تلقین کے ساتھ چند جملے ہی بولے تھے کہ مجھے یونیورسٹی کے وائس چانسلر چوہدری محمد علی صاحب مجمع کی جانب آتے نظر آئے۔ لہذا میں نے اُن سے درخواست کی کہ وہ ایک بزرگ کی حیثیت سے اپنے طلباء کو سنبھالیں اور میں اپنے بھائی کی تیمارداری کی طرف متوجہ ہو گیا۔

اس واقعے سے چند روز پہلے ہم نے پشاور کے تاریخی کَنِنگھم پارک میں اُس وقت کے جملہ مقتدر سیاسی زعماء کے خیالات و اِرشادات سُنے۔ ان میں خواجہ ناظم الدین، مولانا عبدالحمید بھاشانی، مولانا فرید احمد، عبد الولی خان، مولانا عبد الباقی، محترمہ فاطمہ جناح، سب ہی تو شامل تھے۔ یہ اِجلاس سابق سُرخ پوش رہنما عبدالولی خان کی صدارت میں ہوا اور اس دن پہلی دفعہ تقسیمِ ہندوستان کے بعد سابقہ کانگریسی اور سُرخ پوش، مسلم لیگیوں کے دوش بدوش ایک ہی میدان میں اپنے اپنے مخصوص لباس اور جھنڈوں کے ساتھ نظر آرہے تھے۔ اُس وقت کی نیشنل عوامی پارٹی کے ایک کارکن اور مشہور شاعر شاد محمد میگےؔ جو ایک بھاری بھرکم انسان تھے لیکن تخلص میگےؔ (چیونٹی) رکھتے تھے، اپنے رزمیہ اشعار سے سامعین سے داد وصول فرما رہے تھے۔ اور بار بار مادرِ ملت کی جمہوریت اور قومی آزادی کیلئے تڑپ کو خراجِ تحسین پیش کررہے تھے۔ گراؤنڈ میں میرے ساتھ ایک عُمر رسیدہ سُرخ پوش کارکن سُرخ ٹوپی پہنے اور اپنا پھریرا ہاتھوں میں لئے بے تابی سے مادرِ قوم کی آمد کے انتظار میں اپنے قدموں پر براجمان تھے۔ مادرِ ملت تشریف لائیں۔ مداحوں نے والہانہ استقبال کیا۔ تقریر شروع ہوئی تو اُس وقت کی مزدور کسان پارٹی کے رہنما محمد افضل بنگش نے ترجمانی کے فرائض سنبھالے۔ محترمہ نے پہلا خیر مقدمی جملہ اُردو میں بولا اور اُس کے بعد انگریزی تقریر شروع ہوئی۔ میرے برابر بیٹھے ہوئے بزرگ جو محض پشتو زبان سے آشنا تھے، اُنہوں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری، گھاس پر پالتی مار کر آرام سے بیٹھ گئے، یہ فرماتے ہوئے ''اچھا تو ہماری ماں تو انگریز نکلی!''۔

اور پھر ہم چند روز بعد تاریخی چوک یادگار میں جماعتِ اسلامی کے بانی حضرت ابوالاعلیٰ مودودی کے

جلسے میں بھی اپنے دوستوں کے ہمراہ شریک ہوئے۔ اُن کی جچی تُلی اور مدلل گفتگو پہلی اور آخری مرتبہ بالمشافہ سُنی۔ ابھی تقریر جاری تھی کہ مسلم لیگی رہنما کریم اللہ دُرانی نے اُن کے کان میں کچھ کہا۔ اور پھر مودودی صاحب کی زبانی ہم نے پاکستان کے دوسرے گورنر جنرل اور دوسرے وزیرِ اعظم جناب خواجہ ناظم الدین کے انتقال پُر ملال کی اندوہناک خبر سُنی جو حُسین شہید سہروردی کے بعد اس دور میں صفِ اول کے سیاسی رہنماؤں میں سے غالباً دوسرے شہیدِ جمہوریت بنے۔

پشاور یونیورسٹی ایک اقامتی درسگاہ تھی اور آج بھی ہے۔ اسکا پُرسکون اور سرسبز و شاداب ماحول نوخیز اذہان پر اپنے انمٹ نقوش چھوڑ جاتا ہے۔ جہاں علمی و تحقیقی تشنگی بُجھانے کیلئے اگر ایک طرف اچھی لائبریریاں موجود ہیں تو ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کیلئے بڑے، چھوٹے ہر نوع کی تمام تر سہولیات سے مُزّین ہال بھی کم نہیں۔ کھیلوں کی ترویج کیلئے ہر طرف پھیلے ہوئے خوبصورت میدان بھی اس رومان پرور ماحول کو مزید حسین بنانے میں اپنا خوبصورت کردار خوب ادا کرتے ہیں۔ محنتی اَساتذہ کسی بھی درسگاہ کا ایک عظیم اثاثہ ہوتے ہیں۔ کتابوں سے قریبی تعلق رکھنے کا درس تو ہمیں پہلے دن مل گیا جب ہمارے اُستادِ محترم ریاض صاحب نے اپنے مضمون میں محض پاس ہونے کیلئے ڈیڑھ سو کتابوں کے مطالعے کا نسخہ بتایا۔ اُس وقت تو ایک لمحہ کیلئے ہم پر سکتہ طاری ہو گیا۔ لیکن پھر تجربے نے یہی سکھایا کہ اُستاد کی بات میں بہت وزن ہے۔ ایک نوخیز ملک کے اَنگنت مسائل میں سے ایک مسئلہ اچھی کتابوں کی عدم دستیابی بھی ہے۔ وہ رات مجھے ہمیشہ یاد رہے گی جب بین الاقوامی امور کی پروفیسر شومان کی کتاب مجھے صرف اُس رات میسر ہو سکی جب دوسرے دن میرا اس مضمون کا پرچہ تھا اور اتفاق سے ہماری لائبریری میں اس کتاب کا یہی ایک نسخہ تھا۔ اسکی عظیم ضخامت کو دیکھ کر پہلے تو ایک عجیب وحشت طاری ہو جاتی تھی، لیکن کتاب تھی واقعی لاجواب۔ رات بھر کا آرام تو برباد ہوا لیکن میں نہیں، کتاب ختم ہو چکی تھی۔ اس قسم کے تجربوں سے تو اکثر گذرنا پڑتا تھا۔

فیض صاحب سے ملاقات

یونیورسٹی کے ٹیچر، سٹوڈنٹس سنٹر ہی میں ہماری ملاقات اُردو کے مایہ ناز شاعر اور انگریزی ادب کے مُستند اُستاد فیض احمد فیض سے ہوئی۔ میں اور مستقبل کے سفارت کار شفقت کاکاخیل اُنکی خدمت میں حاضر ہوئے۔ فیض صاحب کسی تقریب میں شرکت کے سلسلے میں پشاور تشریف لائے تھے۔ دوبدو ملاقات میں فیض صاحب کی

پُر وقار سنجیدگی، متانت اور کم گوئی کا سارا راز ہم دونو جوان مداحوں پر یوں منکشف ہوا کہ اس خامشی پر تو ہزار تقریر بھی فِدا ہو۔ اُن کی نپی تُلی گفتگو اور ادب و سیاست دونوں پر مضبوط گرفت فیض صاحب کی جملہ وابستگیوں، ترقی پسند ادب کی تحریک، پنڈی سازش کیس، طویل سلسلہ قید و بند، ملکی صحافت میں کردار اور پھر لینن امن انعام کیلئے نامزدگی کی ساری داستان برزبانِ حال بیان ہوتی گئی۔ اُن ہی دنوں اُنکی نئی تصنیف ''دست تہ سنگ'' چھپی تھی۔ ایک ہی ملاقات میں ہمیں اُنکے کلام کی واضح تشریح مل چکی تھی اگرچہ یہ نظم ہم برسوں پہلے پڑھ چکے تھے۔

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
ہاں تلخیءِ ایام ابھی اور بڑھیگی
ہاں اہلِ ستم مشقِ سِتم کرتے رہیں گے

ڈارون اور ماموں

یونیورسٹی کے ہاسٹل نمبر 2 میں ہمارے وارڈن انجینئرنگ کالج کے پروفیسر جمال خان صاحب تھے جو بعد میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر بھی مقرر ہوئے۔ شروع میں وہ ہم سب پر بڑی مُشفقانہ نظر رکھتے اور ہمیشہ بڑی محبت سے ملتے تھے۔ ایک دن اُنکے سویٹ سے گزرتے ہوئے ہماری نظر اُنکے باہر لگے ہوئے بورڈ پر پڑی جس پر لکھے ہوئے حروف وارڈن (WARDEN) کو کسی شریر طالب علم نے بدل کر ڈارون (DARWEN) بنا دیا تھا۔ اور پھر جو شخص بھی اُدھر سے گزرتا، بورڈ پر نظر پڑتے ہی قہقہہ لگا دیتا۔ بطورِ ہمدردی ہم نے مناسب سمجھا کہ وارڈن صاحب کو اس مضحکہ خیز صورتِ حال سے آگاہ کر دیا جائے۔ جمال خان صاحب باہر آئے بورڈ کو دیکھا، پہلے تو محظوظ ہوئے اور پھر خشمگین آنکھوں سے ہمیں دیکھا گویا یہ کھیل ہم ہی نے کھیلا ہے۔ چند روز بعد ہمارے کمرے میں اُنہوں نے جھانکا، ہم اپنے مطالعہ میں مُستغرق تھے۔ پوچھا! تمہارے پاس بجلی کا ہیٹر ہے۔؟ ہم نے کہا خود ہی دیکھ لیں۔ فرمانے لگے! تمہارے پاس ہیٹر ضرور ہوگا اور میں نے دیکھا تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ہوگا۔ واضح رہے کہ اُن دنوں یونیورسٹی کے ہاسٹلز میں بجلی کا ہیٹر رکھنا بڑا جُرم سمجھا جاتا تھا۔ اس دھمکی کے بعد ہر چار روز بعد جمال خان صاحب ہماری چوری پکڑنے آدھمکتے تھے۔ لیکن انہیں کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ ایک شام شومئی قسمت ہمارے ماموں اِمام شاہ ہمیں ملنے ہاسٹل آ پہنچے۔ سردی کا موسم تھا اور ہمارا پہلی منزل پر کمرہ زمہریر بنا ہوا

تھا۔ ماموں صاحب سردی سے کانپنے لگے۔ اُنہیں کمبل دے کر گرم کرنے کی کوشش کی لیکن وہ فرمانے لگے کیوں تمہارے پاس کوئی ہیٹر نہیں ہے۔؟ ہم نے اُنہیں وارڈن صاحب کی دھمکی سے آگاہ کیا۔ ماموں صاحب نے سُنی اَن سُنی کردی فرمانے لگے! وارڈن صاحب تمہیں جان سے ماردے گا۔ ہیٹر لاؤ اور جان لگا کر پڑھو ورنہ یہ کام ہم خود کر دیتے ہیں۔ سوات کے رہنے والے ہمارے روم میٹ یہ سُن کر اپنا ایک چھوٹا سا خود ساختہ ہیٹر نکال لائے اور ہمارے ماموں صاحب کے سامنے کمرے کے بیچوں بیچ لگا دیا۔ ماموں صاحب بستر پر پالتی مار کر بیٹھ گئے اور اپنی پُرانی یادوں کو تازہ کرنے لگے۔ اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ روم میٹ نے کُنڈی کھولی تو وارڈن صاحب کالے کمبل میں لپٹے ہوئے سامنے نظر آئے۔ جونہی ماموں صاحب کی اور اُنکی آنکھیں مِلیں دونوں ایک دوسرے کی طرف بڑھے۔ بیک آواز دونوں نے ایک دوسرے کو خوش آمدید کہا۔ ''ارے تم جمال خان یہاں کیا کر رہے ہو''؟ ماموں صاحب گویا ہوئے ''اور تم کہاں سے نازل ہو گئے'' جمال خان بولے۔ دونوں خوشی سے معانقہ فرمانے لگے تو ہم نے آہستہ سے پاؤں کے ساتھ ہیٹر کو چارپائی کے نیچے کھسکا دیا اور سوئچ آف کر دیا۔ جمال خان مہمان کو اپنے ساتھ لیجانے پر بضد ہو گئے اور ہم نے سکون کا سانس لیا۔

تقریری مقابلے

تقریری مقابلوں میں ہماری دلچسپی اس حد تک برقرار رہی کہ جس مقرر دوست نے ہمیں ساتھ دینے کو کہا، ہم نے انکار نہ کیا۔ اتفاق سے ہمارے یہ سب ہی دوست ہم سے بہتر مقرر یا یوں کہیئے ڈیبیٹر ثابت ہوئے، لہٰذا ہمیں اکثر و بیشتر شاندار کامیابی نصیب ہوئی۔ اپنے دیرینہ عزیز دوست اور طوطئی خوش گُفتار ضیاء الرحمٰن کے ساتھ مل کر گورنمنٹ کالج برائے خواتین واہ کینٹ اور ایجوکیشن کالج پشاور یونیورسٹی سے اُردو مباحثوں کی ٹرافیاں اُٹھانے میں کامیاب ہوئے۔ انجینئرنگ کالج پشاور کی آل پاکستان انگلش ڈیبیٹ کی شیلڈ شعبہ اقتصادیات کے حق نواز خان کی شراکت میں اور گورنمنٹ کالج ڈیرہ اسماعیل خان کی آل پاکستان پشتو مباحثے کی ٹرافی جغرافیہ ڈیپارٹمنٹ کے عبدالصمد آفریدی کی ہمراہی میں جیتی وغیرہ وغیرہ۔ اور یوں اپنے شعبے اور پشاور یونیورسٹی دونوں کیلئے اس میدان میں خوب سرگرم رہے۔ غالباً اسی بناء پر یونیورسٹی نے ہر شعبہ سے چیدہ چیدہ طلباء کے ساتھ بہترین ڈیبیٹر کی سیٹ پر اپنے خصوصی تعمیر شدہ انٹرنیشنل ہال میں ہمیں جگہ مرحمت فرمانا مُناسب سمجھا۔ انٹرنیشنل ہال میں غیر ملکی طلباء بھی رہائش پذیر تھے اور کچھ عرب طالب علم تو خوب مال مَست قسم کے واقع ہوئے تھے۔ رات کو جب سب محنتی طلباء پڑھائی میں مصروف ہوتے یہ

حضرات گاتے بجاتے ہاسٹل میں آدھمکتے۔ شعبہ ریاضی کے نمائندے جو انتہائی محنتی اور دین دار طالب علم تھے۔ وہ تو ایک رات اُن سے اُلجھ پڑے اور اُنکو صلواتیں سُنانے لگے۔ عرب طالب علم کھسیانی بلی کی طرح کھمبا نوچنے لگے اور فرمانے لگے "یا اخی۔ القرآن القرآن" گویا بھائی ہم تو محض قرآن پاک کی تلاوت کر رہے تھے۔

تعلیمی اصلاحات اور ڈوبتا سورج

ایوب حکومت نے اپنی نافذ کردہ **تعلیمی اصلاحات** پر طلباء کی بے چینی کے پیشِ نظر ایک نیا **تعلیمی اصلاحات** کمیشن مقرر کیا۔ اسکے سربراہ سُپریم کورٹ کے جج حمود الرحمٰن صاحب مقرر ہوئے۔ کمیشن پشاور کے دورے پر آیا تو حمود الرحمٰن صاحب ہمارے انٹرنیشنل ہال بھی تشریف لائے۔ ہمارا اُن سے انٹرویو شام کے کھانے پر ڈائننگ ہال میں ہوا۔ اتفاق سے میں دروازے کے ساتھ لگی ہوئی میز پر چنے کی دال کھانے میں مصروف تھا۔ جج صاحب وائس چانسلر کے ہمراہ ہال میں داخل ہوئے تو میری میز پر ساتھ بیٹھ گئے۔ علیک سلیک کے بعد جج صاحب نے پوچھا "آپ کیا کھا رہے ہیں"؟ "جناب وہ چیز آج کھانے کو نصیب ہوئی، جسے کھا کر بھارت اور پاکستان دونوں کی بہادر افواج ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے خواب دیکھ رہی ہیں"۔ اُن دنوں واقعتاً یہی دونوں جانب کے سورماؤں کی معمول کی خوراک تھی۔ ابھی چند مہینے ہی گزرنے نہ پائے تھے کہ ستمبر 1965 کی جنگ چھڑ گئی اور دونوں افواج کو اپنے اپنے انداز میں دادِ شجاعت دینے کے مواقع ہاتھ آ گئے۔ اور دونوں اطراف کے عوام کو محض ہاتھ مَلنے کے علاوہ معاہدہ تاشقند دیکھنے کو ملا۔ جس کے فوراً بعد بھارتی وزیر اعظم شاستری جی سورگباشی ہو گئے اور ایوب خان صاحب کی قسمت کا سورج آہستہ آہستہ ڈوبنے لگا۔ اُن کی تمام تر اصلاحات صدا بصحرا ثابت ہوئیں۔

یونیورسٹی کے کانوکیشن ہال میں جہاں ہم نے لبنان کے ہر دلعزیز وزیر اعظم جناب رشید کرامے کو اعزازی ڈاکٹر آف لاز کی ڈگری حاصل کرتے ہوئے دیکھا، وہیں خود بھی پہلے بی ایس سی اور دو سال بعد ایم اے کی ڈگری سے سرفراز ہوئے۔ پہلی دفعہ مغربی پاکستان کے اُس وقت کے گورنر محمد خان کالا باغ بحثیت چانسلر صدارت فرما رہے تھے۔ تو پاکستان کی سپریم کورٹ کے جسٹس اے۔ آر کارنیلیس خُطبہءِ خصوصی ارشاد فرما رہے تھے، جبکہ دوسری دفعہ افواجِ پاکستان کے وہ واحد سپاہ سالار جو سپاہی سے کمانڈر انچیف کے عُہدہ جلیلہ تک پہنچے تھے، بحیثیتِ مہمانِ خصوصی خطبہ کانوکیشن پیش کر رہے تھے۔ جہاں کارنیلیس صاحب کا خطاب علم و حکمت اور قانون شناسی کے جوہر سے مُزّین تھا تو جنرل موسیٰ لامحالہ ایک سپاہی اور مجاہد کی زبان بول رہے تھے۔ جنرل صاحب فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد مغربی پاکستان کے گورنر اور ساتھ ہی صوبے کی سب یونیورسٹیوں کے چانسلر بھی بنے۔

ریڈیائی لہروں پر

اگست 1965 میں ہمارے ایم۔اے کے امتحان کا نتیجہ مِلا تو فوراً غمِ روزگار دامن گیر ہوا۔اپنی اُستادِ محترمہ ڈاکٹر افسر سلیم صاحبہ کے مشورے پر ریڈیو پاکستان پشاور کے دفتر پہنچا۔قاضی احمد سعید صاحب ڈائریکٹر کے فرائض انجام دے رہے تھے۔وہ قیامِ پاکستان سے پہلے ہماری خیبر سٹوڈنٹس یونین کے صدر بھی رہ چکے تھے۔اُنہوں نے تو گویا ہمیں سر پر بٹھالیا۔اپنے تمام پروڈیوسرز کی کانفرنس طلب فرمائی اور ہمارا تعارف کرایا۔اُسی وقت ہمیں دو مختلف النوع کام سپرد کر دئے گئے۔ایک تو رات کے وقت یونیورسٹی راؤنڈ اَپ نامی پروگرام میں طلباء اور طالبات کی سرگرمیوں پر مبنی خبریں سُنانی تھیں۔جبکہ ایک دوسرے پروڈیوسر صاحب کی خواہش پر ہم قوم کو اُنکے حقوق و فرائض سمجھانے میں مصروف ہو گئے۔ یونیورسٹی راؤنڈ اپ تو انگریزی میں چلتا تھا جبکہ حقوق و فرائض پر بات پشتو میں ہوتی تھی۔

اُن دنوں یونیورسٹی نے اپنے وقت کے دو جیّد پروفیسر حضرات کی سابقہ خدمات کو خراجِ تحسین پیش کرنے کیلئے اُنہیں اعزازی پروفیسر گردان کر یونیورسٹی کیمپس پر رہائش گاہیں مہیا کیں، تا کہ یونیورسٹی کے طلباء اور تدریسی عملہ ماضی کے ان بزرگوں سے ذہنی اور روحانی پاکیزگی حاصل کر کے مستفید ہو سکیں۔ان میں ایک تو فلسفہ اور تصوف کے اُستاد لالا عبدالرحیم نیازی تھے اور دوسرے ڈاکٹر عمر حیات مَلک صاحب تھے۔لالا صاحب 1913 سے اسلامیہ کالج سے وابستہ تھے۔جبکہ ڈاکٹر صاحب اسلامیہ کالجیٹ سکول اور اسلامیہ کالج کے پرنسپل رہ چکنے کے علاوہ پاکستان کی پہلی کابینہ میں جناب لیاقت علی خان کے ساتھ مرکزی وزیر اور بعد میں انڈونیشیاء میں پاکستان کے سفیر بھی رہے۔

جنگ ستمبر

ستمبر 1965ء میں پاک بھارت جنگ ہوئی تو دونوں بزرگ اپنی اپنی رہائشگاہیں ہم خادِمین کے حوالے کر کے محفوظ مقامات پر چلے گئے۔شروع میں تو پشاور کا ہوائی اڈہ جو یونیورسٹی کے قریب واقع ہے، بھارتی بمباری سے محفوظ تھا، اور پڑوسی ملک افغانستان کی شاہی حکومت برابر اعلانات فرما رہی تھی کہ اگر پشاور پر بمباری ہوئی تو حکومتِ افغانستان اُسے اپنے خلاف ایک غیر دوستانہ عمل سمجھے گی۔افغانستان کے اس علاقے پر تاریخی دعویٰ کے پسِ منظر میں حکومتِ پاکستان تو اس قسم کے اعلان کو خود غیر دوستانہ فعل سمجھتی تھی لیکن پشاور کے لوگ افغانستان اور بھارت کے دوستانہ روابط کے تناظُر میں اپنے آپ کو کچھ زیادہ محفوظ سمجھنے لگے۔لیکن جب پشاور پر

بھارتی فضائیہ نے تابڑ توڑ حملے شروع کردئے تو سادہ حضرات اکثر یہ کہتے سُنائی دیتے کہ ''کدھر گیا ہمارا بادشاہ ؟''۔ پشاور بلکہ سارے پاکستان نے پہلی مرتبہ رات کے وقت بلیک آؤٹ کا سامنا کیا۔ ہمارے دوست پروفیسر معراج مصطفیٰ صاحب کچھ ہی دن پہلے کابل سے دو قیمتی تحائف ساتھ لائے تھے جو اُنکو اُنکے برادرِ بزرگ سراج الحق گران صاحب، جو ریڈیو کابل اور اُس سے پہلے آل انڈیا ریڈیو کی پشتو سروس کے والی موالی رہ چکے تھے اور ہر دو جگہ با اثر سیاسی وادبی حلقوں میں اپنا رسوخ رکھتے تھے، نے عنایت کیں تھیں۔ ان میں سے ایک تو انتہائی قیمتی ہاتھ کی گھڑی تھی جو گراں صاحب کو شاہ سعود کی جانب سے عطاء ہوئی تھی اور دوسرا ایک عظیم الجسامت طاقتور ریڈیو گرام تھا۔ دونوں جانب کی کامیابیوں کے دعووں اور تباہ کاریوں کی لمحہ بہ لمحہ خبروں کیلئے اس نعمتِ غیر مترقبہ کا بھرپور استعمال ہو رہا تھا۔ گھپ اندھیرے میں ریڈیو سے نکلنے والی روشنی کو چھپانے کیلئے کم از کم تین کمبلوں کی ضرورت تھی۔ لالا صاحب کا بنگلہ جہاں ہم مقیم تھے اُس وقت یونیورسٹی کیمپس کے انتہائی حدود پر واقع تھا جہاں سے ہوائی اڈے کے گرد نصب طیارہ شکن توپوں کی گھن گرج، دشمن جہازوں سے پھینکی جانے والی روشنیاں اور جوابی گولہ باری کا منظر صاف نظر آتا تھا جو آج بھی بھولنے سے بھلایا نہیں جا سکتا۔ رات بھر آنکھوں میں کاٹتے لیکن ہر جانب سے ملنے والی تفصیلات غور سے سُنتے لیکن جونہی فضائی حملے کا سائرن سُنتے برابر والے ڈاکٹر صاحب کے بنگلے کے لان میں بڑے قرینے سے بنائے ہوئے زمینی مورچوں میں کود پڑتے۔

خُدا خُدا کر کے برصغیر کے ان دو متحارب پڑوسیوں کی جنگ ختم ہوئی۔ سوویٹ یونین کے صدر کوسی چن کی مصالحتی کوششوں کے نتیجے میں صدر پاکستان فیلڈ مارشل ایوب خان اور بھارتی وزیر اعظم لال بہادر شاستری نے تاشقند میں امن سمجھوتے پر دستخط کئے۔ ساتھ ہی پاکستانی سیاست میں ایک نہایت اہم اور دور رَس تبدیلیوں کا آغاز ہوا جب پاکستانی عوام کو اپنے اُس وقت کے وزیر خارجہ جناب ذوالفقار علی بھٹو کی صورت میں ایک نیا ہیرو مل گیا۔ جنہوں نے تاشقند کے معاہدے کی شرائط سے اختلاف کرتے ہوئے اپنے فوجی سرپرست سے اپنی راہیں جُدا کرنے کی ٹھان لی، اپنی علیحدہ پاکستان پیپلز پارٹی قائم کی اور فیلڈ مارشل ایوب خان اور پھر جنرل یحییٰ خان کی ناؤ کے ڈوبنے کا انتظار کرنے لگے۔ لیکن بھٹو صاحب کو اقتدار ملنے میں ابھی مزید چھ سال اور ایک اور پاک بھارت جنگ کی خونریزی درکار تھی۔

جنگوں سے انسانی مسائل شاذ و نادر ہی حل ہوتے ہیں، لیکن قوموں کی اتحاد و یگانگت اور جذبہ قربانی کیلئے ایسی قومی بقاء کی جنگیں مہمیز کا کام ضرور دیتی ہیں۔ پشاور یونیورسٹی کے طلباء اور اساتذہ دفاعی فنڈ میں حصہ لینے کیلئے ایک روز

وائس چانسلر کی سرکردگی میں پشاور شہر کے بازاروں میں چندہ اکھٹا کرنے کیلئے نِکل پڑے۔ پشاور کے اُن دنوں کے ڈپٹی کمشنر نصر من اللہ نے بھی اس کارِ خیر میں ساتھ گھومنے کی حامی بھری۔ میں ریڈیو پاکستان کے یونیورسٹی میگزین کے نمائندے کی حیثیت سے ہمراہ تھا۔ ''خیبر بازار'' اور تاریخی ''قصہ خوانی بازار'' سے ہوتے ہوئے ''صرافہ بازار'' میں گئے۔ کاروباری حضرات نے دل کھول کر مادرِ وطن کے دفاع میں ہاتھ بٹایا۔ اکثر لوگ تو قومی جذبہ سے سرشار نظر آئے لیکن کچھ بڑے مگر مچھ جب کنجوسی پر تُلے نظر آتے تو ڈپٹی کمشنر صاحب اپنے حفاظتی پولیس گارڈ کی خدمات سے استفادہ فرماتے۔ لیکن دفاعِ وطن کی خاطر مالی قربانی کا ایک واقعہ میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا، جب صرافہ بازار ہی میں اوپر ایک چھوٹے سے چوبارے سے ایک خاتون نے اپنے طلائی کنگن فنڈ میں جمع کرنے کیلئے نیچے پھینک دئے۔

پاک بھارت کی یہ جنگ محض 17 دن رہی۔ اس سے زیادہ دونوں مما لک مزید تباہی اور بربادی کے متحمل نہیں ہوسکتے تھے۔ دونوں اطراف کا اسلحہ کا ذخیرہ کافی حد تک کم ہو چکا تھا اور ساتھ ہی دونوں اقوام کو اپنے اپنے پیٹ پر پتھر باندھنے کی ضرورت پیش آئی۔ کچھ عرصہ تک تو محض افواج میں کمی پوری کرنے کیلئے بھرتیاں ہو رہی تھیں اور دیگر ملازمتوں پر پابندی بھی لگانی پڑی۔ سب پڑھے لکھے نوجوان شارٹ سروس کمیشن حاصل کرنے کیلئے دوڑ دھوپ کرنے لگے۔ میں نے ایک روز فوج کی ''ایجوکیشن کور'' میں بھرتی کا اشتہار دیکھا تو فارم لے کر بھجوا دیا۔ انٹرویو اور آئی ایس ایس بی کے مراحل کامیابی سے طے کرنے کے بعد ہمیں جی ایچ کیو سے ''گریجویٹ کورس'' میں شامل ہونے کا دعوت نامہ ملا۔ اُس وقت چونکہ ہم سِول ملازمتوں کے مقابلے کا تحریری امتحان دے رہے تھے لہذا جی ایچ کیو کو کوئی جواب نہ دے پائے۔ دو ماہ بعد جی ایچ کیو سے دوبارہ ''شارٹ سروس کمیشن'' کی پیشکش ہوئی۔ اس دوران چونکہ ہم اپنا مقابلے کا تحریری امتحان پاس کر چکے تھے لہذا جی ایچ کیو کی یہ پیشکش قبول کرنے سے معذرت کرلی۔ خُدا کے فضل وکرم سے اس تمام عرصے میں ہمیں یونیورسٹی کے ماحول میں رہنے اور اس کی لائبریریوں اور اپنے اَساتذہ کرام کی رہنمائی سے مستفید ہونے کا موقع یوں حاصل رہا کہ یونیورسٹی کیمپس پر ہی یونیورسٹی پبلک سکول میں ایک تدریسی آسامی پر کام کرنے کا موقع ملا اور اپنے عِلم پرور دوست پروفیسر معراج مصطفیٰ کے ساتھ اسلامیہ کالج کے بیچلر فلیٹس میں رہائش کی سہولت بھی دستیاب ہوگئی تھی۔ یونیورسٹی پبلک سکول کی شہرت ایک اچھے تعلیمی ادارے کے طور پر اُن دنوں اپنے سربراہ جارج میکلرائے اور اُن کے باہمت عملے کی وجہ سے خوب زوروں پر تھی۔

باب سوئم

کیڈٹ کالج

صوبہ سرحد کا پہلا کیڈٹ کالج کوہاٹ میں کھل چکا تھا۔ وہاں ایک آسامی کیلئے عرضی دی تو پرنسپل کرنل (ریٹائرڈ) فیض اللہ خان نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اور پھر چند مہینے اس نامور نیم فوجی تعلیمی ادارے سے بھی وابستہ رہا۔ یہاں پر ہمارے رفقائے کار ایک سے ایک باغ میں چُنے ہوئے پھولوں کی مانند تھے۔ محنت اور اپنے کام سے لگن میں سب ہی اپنی مثال آپ تھے۔ کرنل فیض اللہ خٹک خود ایک فوجی پسِ منظر کے باوجود اُس وقت تک ایک معروف ماہرِ تعلیم کے طور پر اپنا لوہا منوا چکے تھے۔ اس سے قبل وہ پشاور یونیورسٹی کے ایک نہایت فعال رجسٹرار کی حیثیت سے اور ایک خلیق اُستاد کے طور پر بھی اپنی پہچان رکھتے تھے۔ میرے سینئیر رفقاء میں سواتی صاحب، رفیق صاحب، شمس صاحب، نور محمد بنگش، ہاشمی صاحب، خورشید انور بیگ، چوہدری انوار صاحب، طِلا محمد، میر کبوت خان اور عبدالرحیم ناگوری، سب نے بعد میں ملک کے چیدہ چیدہ علمی اداروں کی بھاگ دوڑ سنبھالی۔ ناگوری ایک مشہور آرٹسٹ کے طور پر سالوں مُلکی سطح پر چھائے رہے۔ سندھ یونیورسٹی کے شعبہ فائن آرٹس کے سربراہ کے طور پر اُنہوں نے جدید تصوراتِ فن پر جو کتابیں لکھیں اور مقالے شائع کئے اُنکو ملکی اور غیر ملکی اخبارات میں خاصی پذیرائی نصیب ہوئی۔ نواب عالم باہروی صاحب ایک دانش ور اور شعلہ بیان مقرر تھے لیکن بعد میں پاک آرمی کے ایجوکیشن کور کے مدارالمہام بننے کے بعد اُنکی خُداداد علمی وفکری صلاحیتوں کا کیا بنا یہ الگ ہی داستان ہے۔ مجھے کالج کے اقبال ہاؤس کا ٹیوٹر بھی لگا دیا گیا تھا جہاں اپنے محترم رفیق پروفیسر ملازم حُسین ہمدانی کے ہمراہ گویا نوزائیدہ پودوں کی نگہداشت اور آب یاری کا فرض حوالہ کر دیا گیا۔ ہمدانی صاحب بیروت کی امریکی یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے۔ ایڈورڈ کالج پشاور میں اقتصادیات کے پروفیسر رہ چکے تھے لیکن اب وہ انگریزی لسانیات پڑھاتے تھے اور اپنا ایک جُداگانہ طرزِ تدریس رکھتے تھے۔ یہ تو بہت بعد میں معلوم ہوا کہ ہمدانی صاحب جوتلہ کنگ کے ایک مشہور مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، اُن کے والد بزرگوار اور میرے والد محترم دونوں انگریزی فوج کے ایک ہی پلٹن سے متعلق رہے ہیں۔ اور جب ہم نے دونوں بزرگوں کی نصف صدی بعد ملاقات کرائی تو بڑے ہمدانی صاحب نے مجھے دیکھ کر فرمایا۔ ’’واہ بھئی تمہاری مستانی

جوانی تو ابھی تک قائم ہے بالکل ویسے ہی ہو' یہ تو اُنہیں تھوڑی دیر بعد معلوم ہوا کہ اکثر بیٹے والدین کی ہو بہو کاپی بن جاتے ہیں۔لیکن جہازِ عمرِ رواں اپنے منازل بہرصورت طے کرتا رہتا ہے۔

طفیل صاحب نہایت ہی زیرک اُستاد تھے۔گورنمنٹ کالج لاہور سے بیالوجی میں گولڈ میڈل حاصل کر چکے تھے۔لیکن ساتھ ہی بلا کے اچھے باورچی بھی تھے۔اُنکی پکائی ہوئی ڈش کیساتھ واقعی اُنگلیاں چاٹنی پڑتی تھیں۔ یہاں تک کہ میرے نئے ملازم تو کافی دنوں تک اُنہیں کالج کا سب سے بڑا خانساماں سمجھتے تھے۔منظور حُسین کلیامی انگریزی کے اُستاد تھےلیکن اس سے پیشتر کافی عرصہ ریلوے میں ملازمت کر چکے تھے،لہذا لیکچر دیتے وقت اُنکے ہر اشارے کے پیچھے ریلوے گارڈ کی لال اور سبز جھنڈیاں سب طالب علم چشمِ تصور میں دیکھ سکتے تھے۔طِلاّ ایک بے قرار روح تھی۔پاکستان ملٹری اکیڈمی کو آدھے راستے میں چھوڑ کر اس نئے کیڈٹ کالج میں علم تاریخ پڑھانے آ نکلے تھے۔لیکن بذلہ سنجی منظور کلیامی اور طِلاّ دونوں کا بہترین ہتھیار تھا اور ظریفانہ گفتگو کا ہر میدان اِن دونوں حضرات کے ہاتھ سے کبھی نہ جاتا تھا۔مسرور انور کیفی اُردو ادب کے اُستاد اور ایک معروف شاعر و ادیب تھے۔ہمارے دوست سلیم پرویز اگرچہ انگریزی ادب پڑھاتے تھےلیکن کیفی صاحب کے مقابلے میں روز شعر گوئی کی اپنی سی کوشش ضرور فرماتے۔اور جب کالج کے مکمل طور پر تھکا دینے والے دن کے آخر میں دوستوں کی محفل لگتی تو چمنستانِ شاعری کی خوب آبیاری ہوتی۔جب سب کی آنکھیں تھکاوٹ سے مخمور نظر آنے لگتیں تو سلیم صاحب اپنا یہ شعر ضرور پڑھتے۔

پلکیں جھپک رہی ہیں، نیند آ رہی ہے اُن کو

لو بند ہو رہا ہے میرا شراب خانہ

ادبی ذوق کا تو یہ عالم تھا کہ کالج کا غیر تدریسی عملہ جن میں کالج کے برسر خالد، لائبریرین نقشبند خٹک اور ہیڈ کلرک قریشی صاحب، کالج کے ایڈجوٹنٹ - میڈیکل افسر اور فوجی قواعد سکھانے والے صوبیدار اور حوالداران صاحبان سب ہی اپنی اپنی بساط تک شاملِ حال ہوتے تھے۔ہمارے ایک اور دوست شیخ کرم الٰہی کے ذوقِ آگاہی کا تو ایک مخصوص ہی انداز تھا۔اپنے خاندانی کاروباری پسِ منظر کے باعث اُن کی نظر میں سرکاری ٹیکسیشن مشنری کی بڑی اہمیت تھی۔سو جب مجھے محکمہ انکم ٹیکس کی جانب سے ملازمت کی پیشکش ملی تو شیخ صاحب تو گویا میری جان کے پیچھے پڑ گئے۔صبح شام یہی تقریر فرماتے جاتے تھے'' بھائی اگر مستقبل بنانا ہے تو انکم ٹیکس آفیسر بننے کے علاوہ کچھ مت سوچو۔کم از کم کوئی دفتر ہوگا، میز کُرسی ہوگی، دفتر کے دروازے پر چک

لگی ہوگی، گھنٹی ہوگی، چپڑاسی ہوگا، اور کاروباری حضرات دفتر کے چکر کاٹ رہے ہونگے ۔ یہاں کیا رکھا ہے۔؟ تیس عدد اَساتذہ کا ایک ہی سٹاف روم اور محض ایک ہی ہاشم علی چائے اور پانی پلانے کیلئے ۔کسی کا شومئی قسمت سے کوئی مہمان آجائے تو ہاشم علی کی تلاش شروع ہوجاتی ہے۔گویا وہ نہیں ہم اُس کے نوکر ہیں۔غرض شیخ صاحب کی حد سے زیادہ اِنکم ٹیکس نوازی نے مجھے درس وتدریس کے پیغمبرانہ پیشے سے یک گونہ بیگانہ کردیا۔مزے کی بات تو یہ رہی کہ میری دلچسپی کے مضامین تو سفارت کاری (ڈپلومیسی) بین الاقوامی قانون اور بین الاقوامی امور اورادارے تھےلیکن میری پیشہ وارانہ زندگی کا آغاز انکم ٹیکس سے ہورہا تھا اور شیخ صاحب تھے کہ اُنکا اوڑھنا بچھونا کاروباراورانکم ٹیکس کے کارندوں میں شامل ہونا ایک آرزو۔کرم الٰہی صاحب کے نصیب میں پاکستان کی فارن سروس آئی۔1980 کے عشرے میں پڑوسی ملک افغانستان پر سوویٹ یونین کے قبضے کے دوران وہ افغان ڈیسک کے انچارج رہےاور مرحوم صدر جنرل ضیاءالحق کی افغان پالیسی ٹیم کے ایک اہم رُکن رہے۔ بعدازاں کئی مما لک میں بطور ایک سینئر سفارت کار کے کام کرتے رہے۔

حسبِ توقع کیڈٹ کالج کوہاٹ سے بڑے ہی ہونہار طالب علم برآمد ہوئے جنہوں نے نہ صرف ملکی افواج کے مختلف شعبوں میں اپنی بہترین خدمات پیش کیں ، بلکہ بحثیت اچھے انجینئر ،ڈاکٹر، وکیل ،سول سرونٹ اور بزنس مین بھی کالج کے نام کو چار چاند لگائے۔اس کا اندازہ مجھے اُس وقت ہوا جب کالج کے سابقہ طلباء کی انجمن نے کوئی ربع صدی گزرنے کے بعد اپنے ایک اجلاس منعقدہ اسلام آباد کلب میں اپنے اولین دو ساتھیوں کے پاک آرمی میں جنرل کے عہدے پر متمکن ہونے کی خوشی میں ایک شاندار تقریب کا اہتمام کیا،تو ہر شعبہ زندگی کے جھلملاتے ہوئے ستاروں کی کہکشاں میں اپنے ہی بے شمار عزیز طالب علم نظر آئے۔

تربیت گاہِ انکم ٹیکس

کراچی پاکستان کا سب سے بڑا شہر، واحد بڑی بندرگاہ اور ملکی کاروبار کا سب سے بڑا مرکز ہے۔اس شہر کے کشمیر روڈ پر انکم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ نے اپنے نئے افسران کی پیشہ ورانہ تربیت کیلئے مرکز قائم کیا ہوا تھا۔صوبہ سرحد کے ایک نسبتاً خاموش اور بلند پہاڑوں سے ڈھکی ہوئی خوبصورت وادی کے تاریخی شہر کوہاٹ سے بحیرہ عرب کے کنارے واقع جھلملاتی روشنیوں کے شہر کراچی کی طرف سفر اور پھر وہاں بہادرآباد کے عین مرکز میں سرکار کے مہیا کردہ ہاسٹل میں قیام ایک بالکل ہی جُدا تجربہ تھا۔ ہاسٹل تو ایک تھا لیکن کھانے کے میس دو تھے

یہاں آ کر معلوم ہوا کہ مغربی پاکستان کے چاروں صوبوں اور آزاد کشمیر سے آئے ہوئے زیرِ تربیت افسران اور ہمارے مشرقی پاکستان سے تعلق رکھنے والے ساتھیوں کے کھانے پینے، رہنے سہنے، زبان، اندازِ گفتگو، مُحبتوں اور نفرتوں میں کیا مُشترِک اور کیا مختلف ہے۔ لیکن یہی کچھ تو اس گلدستے کی ساری خوبصورتی تھی۔

ہمارے نہایت ہی قابلِ احترام ڈائریکٹر حسن علی آفندی صاحب سندھ کے اس تاریخی خاندان کے سپوت تھے جنہوں نے سندھ مَدرِسۃُ الاِسلام اور کئی دیگر فلاحی ادارے قائم کئے اور اُن کی وطن دوستی سے بھرپور گفتگو ہم سب کیلئے پیغامِ اخوت کے سوا کچھ نہیں ہوتی تھی۔ اُن کے نائب ہمایوں اختر صاحب نیوی کے لیفٹینینٹ کمانڈر رہ چکے تھے۔ نہایت دلچسپ شخصیت ہونے کے علاوہ وہ اس محکمے کے اُن ایماندار اور فرض شناس افسروں میں سے تھے جن کی مثال ایسے اداروں میں کم ہی ملتی ہے۔ اُس وقت یہ محکمہ مغربی پاکستان کی حد تک چار ڈویژن میں منقسم تھا۔ ہر ڈویژن کا سربراہ انکم ٹیکس کمشنر تھا۔ تین کمشنر تو راولپنڈی، لاہور اور کراچی میں بیٹھتے تھے جبکہ چوتھا کمشنر ہماری ٹریننگ ڈویژن کے آفندی صاحب تھے۔ 1992 میں جب ہم پاکستان ایڈمنسٹریٹو کالج لاہور میں زیرِ تربیت تھے تو صرف ہماری کلاس میں سات عدد کمشنر انکم ٹیکس تھے۔ اس سے اس محکمے کے پھیلاؤ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ آفندی صاحب کہا کرتے تھے کہ اگر انکم ٹیکس کا محکمہ اس ملک سے ختم کر دیا جائے اور عوام کو خود تشخیصی بنیاد پر ٹیکس ادا کرنے کو کہا جائے تو میرا دعویٰ ہے کہ پھر بھی کم از کم اتنا ٹیکس ضرور وصول ہو سکے گا جتنا اس مکمل محکمے کی موجودگی میں ہو رہا ہے۔

ہمیں انکم ٹیکس لاء، اصولِ کھاتہ داری (بُک کیپنگ) وغیرہ کے علاوہ کراچی کے کاروباری طبقے کی عمومی زبان گجراتی بھی پڑھائی جاتی تھی۔ انکم ٹیکس لاء کافی پیچیدہ تصوّر کیا جاتا تھا اور اس کیلئے روزانہ ہمایوں صاحب دو مسلسل کلاسز لیتے تھے۔ دوسرے پیریڈ میں طلباء کی اُلجھنیں دور کرنے کی خاطر ہمایوں صاحب ہمارے سوالوں کا جواب دیا کرتے تھے۔ ایک روز چند طلباء انکم ٹیکس دفاتر سے کسی کام کے سلسلے میں ہو کر آئے تھے۔ اُن کا مشاہدہ تھا کہ اکثر سرکاری دفاتر کی طرح انکم ٹیکس دفاتر بھی عدم توجہی اور صفائی کے فقدان کا شکار ہیں۔ ایک طالب علم نے پوچھا کہ! کیا انکم ٹیکس افسر کو اپنے دفتر پر خرچ کرنے کیلئے کوئی صوابدیدی رقم بھی مہیا کی جاتی ہے۔ ہمایوں صاحب نے برجستہ کہا! ''ہاں بالکل۔ مبلغ بیس روپے'' اس سے تو جناب ایک ٹوٹی ہوئی کرسی کی بھی مرمت نہیں ہوسکتی۔ ادھر کراچی جیسے شہر میں رہنے کو گھر نہ ہو اور لمبے فاصلوں کو طے کرنے کیلئے سواری کا بندوبست نہ ہو تو کیا کیا جائے۔ ہمایوں صاحب بولے! یہ تو بہت ہی آسان مسئلہ ہے۔ صرف آفیسر میں جُراتِ

رندانہ ہونا چاہیے۔''وہ کیسے جناب؟''ہم سب نے یک زبان ہو کر پوچھا۔''بھئی دفتر جاتے ہی اپنے انکم ٹیکس انسپکٹر کو بُلا ئیے اور اُسے حکم دیجئے کہ آپ اپنا دفتر فرنش کرانا چاہتے ہیں، رہنے کو ایک مناسب مکان چاہتے ہیں، اور سفر کیلئے سواری، پھر دیکھئے دوسری صبح ان میں سے کیا کچھ مہیا نہیں ہو جاتا''۔

ایس۔ٹی۔آئی

یونیورسٹی اور علمی ماحول سے تازہ تازہ نکلے ہوئے ایک نوجوان کیلئے ایسی جُراتِ رندانہ پیدا کرنا مشکل نظر آیا۔لہٰذا چند روز بعد میرے لئے اِسٹیبلیشمنٹ ڈویژن سے سیکرٹیریٹ سروس میں شامل ہونے کی پیشکش آئی تو ہمایوں اختر صاحب کے ہی صائب مشورے سے میں نے ہاں کر دی اور پھر زیرِ تربیت سیکشن آفیسر کی حیثیت سے سیکرٹیریٹ ٹریننگ انسٹیٹیوٹ (ایس۔ٹی۔آئی) کی راہ لی۔یہ تربیتی ادارہ بھی اُن دنوں کراچی ہی میں واقع تھا۔ یہاں آ کے معلوم ہوا کہ مملکت کے سارے اصولِ جہانبانی تو یہیں سکھائے جاتے ہیں۔حکومتی مشینری کا کلیدی پرزہ تو سیکشن افسر صاحب ہی ہوتے ہیں۔کیونکہ کسی بھی معاملے میں پہلا قدم اُٹھانے سے قبل اُسکی ایک عدد فائل کھولی جاتی ہے۔اب یہ فائل کیسے کھولی جاتی ہے؟سُرخ فیتہ کیا ہوتا ہے۔زیرِ نظر کاغذ پر''پی۔یو۔سی'' کی سلپ کیسے لگتی ہے؟اس سے پہلے کہ آپ کی نازک اُنگلیوں کا خون ہو، کاغذ میں پِن کیسے ٹھونکی جائے؟یہ اور اس قسم کے دیگر دقیق دفتری مسائل اسی تربیت گاہ میں سکھائے جاتے تھے۔خیر سے کمپیوٹر صاحب نے ابھی سرکاری دفاتر کی راہ نہ دیکھی تھی، لہذا ہم سب کو ٹائپنگ مشین ہی سے کھیلنا پڑتا تھا۔چونکہ کلاس میں آدھے طلباء مغربی پاکستان سے اور باقی نصف مشرقی صوبے سے تعلق رکھتے تھے۔بنگالی افسران تو اکثر و بیشتر اُردو لکھ پڑھ سکتے تھے،مسئلہ ہمارا تھا کہ ہمیں اس دوران بنگلہ سیکھنی پڑتی تھی۔بہر حال اس سلسلے میں ہم سب ایک دوسرے کی بھرپور مدد کرتے تھے۔

ہم سب کی رہائش کا انتظام گارڈن روڈ پر گورنمنٹ ہاسٹل میں تھا۔اس ہاسٹل کی دو خصوصیات ہمیشہ یاد رہیں گی۔ایک تو یہ کہ ہاسٹل کے بالمقابل سڑک کے پار کراچی کا باغِ وحوش یا چڑیا گھر واقع تھا۔ بالکل آدھی رات کو ببر شیر دھاڑنے لگتا تھا۔اُسکی مہیب اور رُعب دار آواز ہم مکینانِ ہاسٹل کو تو لازماً اپنے خوابِ خرگوش سے جگا دیتی تھی لیکن پھر دوبارہ آنکھ لگنا یوں مشکل ہو جاتا تھا کہ شیر جونہی خاموش ہوتا دوسرے جانور از قسم بھیڑیا، گیدڑ،لومڑی، بندر وغیرہ سب اپنی اپنی بساط کے مطابق اپنے جنگل کے بادشاہ سلامت کو اپنی وفاداری کا یقین دِلانے کی خاطر اپنی اپنی بولی میں خراجِ تحسین پیش کرنے لگ جاتے۔جونہی یہ سلسلہ رُکتا، چڑیا گھر کے پرندے

مارے خوف کے چیخنا اور پھڑ پھڑانا شروع کر دیتے اور یوں ہم بے بس و بے زبان انسان اپنے اپنے پنجروں میں جسے ہم کمرے کہا کرتے تھے، اپنے اپنے نرم و گداز بستروں پر باقی رات کروٹ پر کروٹ بدلنے میں گزار دیتے۔ صبح ہوتے ہی جب ہم سب کام پر جانے کیلئے جلدی میں ہوتے اور ہر کوئی اپنے دن کا آغاز ایک گرم چائے کی پیالی سے کرنا چاہتا۔ ایک بڑے میاں ٹرے لے کر تشریف لے آتے اور نہایت مسجّع زبان میں اپنا خاندانی شجرہ نسب اور اپنے بزرگوں کی شاندار تاریخِ ماضی سے اِقتباسات سُنانے شروع ہو جاتے۔ دراصل اُن کا دعویٰ تھا کہ وہ برِصغیرِ ہندوستان کے آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے پوتے ہیں اور ہمیں ''پدر م سُلطان بود'' کی فارسی ضرب المثل سمجھنے کیلئے ان کی داستانِ عبرت انگیز سے بڑھ کر اور کیا سُننے کو مل سکتا تھا۔

کلاس میں پڑھنے کیلئے ہمارا ایک مضمون ''سِول ملازمتوں کی تاریخ'' بھی تھا۔ ہماری ملازمت تو ابھی جمعہ جمعہ آٹھ دن ہی تھی لیکن یہ مضمون ہم سب ہی بڑی دلچسپی اور شوق سے پڑھا کرتے تھے اور مختلف سروسز کا تقابلی جائزہ ہماری آپس کی گفتگو کا خاص موضوع ہوتا تھا۔ سیکرٹیریٹ سروس تو اُس حال میں زیادہ اچھی نہیں سمجھی جاتی تھی، لیکن اس کا اِمکانی مستقبل بہر حال اُمید افزاء تصور کیا جاتا تھا۔ اس نظریے کے حامی تو مطمئن نظر آتے لیکن اس سے مختلف رائے رکھنے والے حضرات نئی راہیں تلاش کرنے کیلئے جدوجہد میں مصروف رہے، اور ''جوئندہ یابندہ'' کے مِصداق اکثر دوستوں نے اپنی من پسند منزل پا ہی لی۔ سلیمان میرا اسلامیہ کالج کے زمانے کا ہم جماعت تھا، وہ اور مقصود بٹ کسٹمز سروس میں چلے گئے۔ سلیمان صاحب ممبر ٹیرف کمشن اور سیکرٹری تجارت کے عہدہ جلیلہ تک پہنچے۔ بٹ صاحب پاکستان ایڈمنسٹریٹو کالج لاہور کے ڈائریکٹنگ سٹاف کے ممبر بنے۔ رفیق حیدر پولیس سروس میں انسپکٹر جنرل پنجاب اور پھر وفاقی تحقیقاتی ادارہ (ایف۔آئی۔اے) کے سربراہ بنے۔ نذر عباس فارن منسٹری میں چلے گئے اور مختلف ممالک میں سفارتی خدمات انجام دیتے رہے۔ سعادت جنیوا میں اقوامِ متحدہ کے ایک ادارے سے منسلک ہو گئے۔ طارق جنجوعہ اور سکندر صاحبان حکومت کے دیگر اعلیٰ ترین عُہدوں پہ پہنچے۔ اور انجینیر مرزا حامد حسن نے تو خیر سے وفاقی سیکرٹری آب و برق بن کر قومی سطح پر ہریالی لانے اور روشنیاں پھیلانے کا مشن پورا کرنیکی کوشش کی۔ راقم الحروف نے نامہ بری پر اکتفا کیا۔ تا کہ انسان کا انسانیت سے محبت کا رشتہ قائم رکھنے میں مدد دے سکے۔ یہ اور بات ہے کہ فی زمانہ کاروباری تعلقات جوڑنا ہی بڑی بات سمجھی جاتی ہے۔

باب چہارم

افسرِ نامہ براں

اُس وقت کی پاکستان پوسٹل سروس میں شمولیت کی یہ پیشکش بھی بندہ کونومبر 1966 میں لئے گئے سِول سُپیریر سروسز کےامتحان کی بنیاد پر ہی جولائی 1968 میں وصول ہوئی۔اُس وقت تک پاکستان کو چار عدد پوسٹل سرکلز میں تقسیم کیا گیا تھا جن کے متعلقہ پوسٹماسٹر جنرل بالترتیب ڈھاکہ، کُھلنا، کراچی اور لاہور میں بیٹھا کرتے تھے۔ جولائی 1968ء میں شمال مغربی علاقے کیلئے ایک نئے سرکل کی تشکیل کی گئی۔اور راقم الحروف اس نئے سرکل میں پہلے زیرِ تربیت افسر کے طور پر شامل ہوا۔اس نئے سرکل کا ہیڈکوارٹر تو پشاور قرار پایا تھا لیکن ضروری انتظامات مکمل ہونے تک کچھ عرصے تک پوسٹماسٹر جنرل کا آفس لاہور ہی میں رہا۔اس سرکل کے پہلے پوسٹماسٹر جنرل بشیرالحسن صاحب تھے جو اتفاق سے کُھلنا سرکل کے بھی بانی پوسٹماسٹر جنرل رہ چکے تھے۔اُن کی تاریخی حیثیت ایک اور وجہ سے بھی تھی کہ اگست 1947ء میں قیامِ پاکستان کے موقع پر وہ متنازعہ جموں کشمیر کے سُپر یٹنڈنٹ پوسٹ تھے اور اُن ہی کے حُکم پر سرینگر کے جنرل پوسٹ آفس پر پاکستانی پرچم لہرایا جاتا تھا۔اس حیثیت کا ذکر پاکستان کے اُس وقت کے وزیرِ خارجہ سرظفراللہ خان نے بطورِ خاص اقوامِ متحدہ کی حفاظتی کونسل میں اپنی تقریر میں کیا۔

بشیرالحسن صاحب ایک انتہائی انسان دوست اور اپنے ملنے والوں کے دل اپنی مخلصانہ گفتگو سے چند لمحوں میں موہ لینے والی شخصیت تھے۔ چونکہ جنگِ عظیم کے دوران وہ آرمی پوسٹل سروسز میں بھی خدمات انجام دے چکے تھے اسلئے اپنے نام کے ساتھ ہمیشہ اپنا فوجی عہدہ ''میجر'' بھی لکھا کرتے تھے۔وادی کشمیر کا تو انہوں نے ایک ایک چپہ چھان مارا تھا اور بڑے شوق اور جذبے سے اُس جنت نظیر خطۂ زمین کی ہر چوٹی، پہاڑ اور درّہ کا ذکر کیا کرتے تھے۔ایک سروئیر کی طرح فاصلوں اور بلندیوں کا حساب اُن کی اُنگلیوں پر ہوتا تھا۔

پہلی اگست 1968ء کو جب میجر صاحب کے سامنے اُن کے دفتر میں مجھے پیش کیا گیا تو اُنہوں نے فوراً ہی گلے لگایا اور بڑے خلوص سے فرمایا ''ویلکم ٹو پوسٹل سروس اینڈ پوسٹل فریٹرنیٹی'' حقیقت یہ ہے کہ ایسا خلوص تو مجھ جیسے کمزور دل انسان کو گھائل کرنے کیلئے کافی تھا اور اُس دن کے بعد میں نے کبھی کہیں اور جانے کا نہیں سوچا۔میرے ساتھ آنے والے سٹاف کے معاملات کے متعلقہ افسر نے میجر صاحب سے پوچھا کہ اس برخوردار کو ٹریننگ کیلئے کہاں

بھیجا جائے۔ میجر صاحب نے پہلے تو مری جی پی او کا کہا لیکن پھر مجھ سے پوچھا ''آپ کا تعلق کہاں سے ہے''؟ جب میں نے اپنا ضلع بتایا تو اُنہوں نے فرمایا کہ انہیں بنوں ہیڈ آفس میں ابتدائی چار ماہ کی ٹریننگ کیلئے بھیج دیا جائے۔ واہ بھئی یہ خوب نوکری ہے کہ بندہ کراچی، لاہور سے ہو کر فوراً اپنے گھر جا کر ملازمت کرے، میں نے دل ہی میں کہا۔ چلو اپنے والدین کو وہاں پہنچ کر ہی سرپرائز دوں گا۔ چونکہ ماڑی انڈس جانے والی ٹرین رات کو آٹھ بجے لاہور سے چلتی تھی جہاں سے ہو کر بنوں جانا تھا، لہٰذا لاہور کی سیر کیلئے چند گھنٹے مل گئے۔ پوسٹ ماسٹر جنرل کے دفتر واقع اصغر مال سے سیدھا شاہی مسجد پہنچا۔ تاکہ نمازِ شکرانہ ادا کیا جا سکے اور اپنے دوست انعام اللہ جان کو ڈھونڈا جائے جو اُن دنوں محکمہ اوقاف کی جانب سے تاریخی مقامات پر ریسرچ کرنے میں مصروف تھا۔ لاہور کا شاہی قلعہ، شاہی مسجد، مقبرہ علامہ محمد اقبالؒ اور رنجیت سنگھ کی سمادھی، یہ سب ایک ہی جگہ تو واقع ہیں۔ مقبرہ اقبال پر حاضری دیتے ہوئے جو پہلا شخص ملا، اُس سے ہی انعام اللہ جان کا پتہ معلوم ہو گیا۔ وہ شریف آدمی بمطابقِ موسمِ لاہور لنگوٹا پہنے مزار کے پہلو میں شاہی مسجد کے ایک حُجرے میں کتابوں کے ایک بڑے ڈھیر کے اندر بیٹھا عینک لگائے اپنے کام میں مصروف تھا۔ مجھے دیکھا اور ایک زبردست قہقہہ لگایا۔ اُس کے مخصوص قہقہے سے گویا اُس نیم اندھیری کوٹھڑی میں روشنی چھا گئی۔ ''اُستاد بڑی صحت بنا رہے ہیں۔ کیا کھاتے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ ''بھائی اللہ سلامت رکھے حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار کو۔ لاہوری ہر کسی سے دھوکہ کر سکتے ہیں لیکن داتا صاحب سے ہرگز نہیں۔ خالص دودھ، دہی، مکھن وہاں سے مل جاتا ہے۔ پلاؤ اور زردے کی دیگیں وہاں پکتی ہی ہیں۔ اوقاف کی ملازمت میں یہی تو خصوصی عنایات ہیں جو صحت کو جلا بخشتی ہیں اور علم کیلئے تازیانے کا کام دیتی ہیں۔'' زمین پر پڑے ہوئے لفافے پر مجھے لکھائی کچھ جانی پہچانی سی نظر آئی۔ ''یہ کس کا خط ہے''۔ میں نے پوچھا ''ارے بھائی چراغ کا خط ہے۔ آج ہی ملا ہے۔ ذرا لفافے پر لکھا ہوا پتہ تو دیکھو۔'' اُس نے مسکراتے ہوئے لفافہ میرے ہاتھوں میں تھما دیا جس پر تحریر تھا ''انعام اللہ جان (ایم۔اے) 3، شاہی مسجد لاہور'' یاد رہے کہ یہ حضرت علمِ تاریخ، آثارِ قدیمہ اور فلسفے میں ماسٹرز کر چکے تھے۔ پشاور میں رہتے ہوئے چونکہ انعام اللہ ہر علمی، ادبی، ثقافتی تقریب میں حاضر ہوتے تھے۔ لہٰذا اُنکے دوست لفافے پر محض اُن کی ایک عدد تصویر لگا کر ساتھ پشاور یونیورسٹی لکھ دیتے اور خط اُن کی خدمت میں پہنچ جایا کرتا تھا۔

پہلا مرحلہ

اپنے شہر بنوں پہنچا تو اگلی صبح سائیکل لی اور اپنی ڈیوٹی پر چھاؤنی میں واقع ضلع کے بڑے ڈاکخانے میں

حاضری دی۔ عمارت کے باہر ایک سُرخ لیٹر بکس کے ساتھ ہی سنگِ میل لگا ہوا تھا جس پر بنوں زیرو میل لکھا ہوا نظر آیا۔ یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ انگریزی دور میں ہمارے فرنگی آقاؤں کیلئے ڈاک کی کیا اہمیت تھی اور یہ کہ سب شہروں کے باہمی فاصلے شہر کے بڑے ڈاکخانے سے ہی ناپے جاتے تھے۔ اتفاق سے یہاں پوسٹ آفس میں اکبر علی نظر آیا۔ وہ ہمارے محلے میں ڈاک بانٹا کرتا تھا اور اب یہاں کلرک تھا۔ اُس سے پوسٹماسٹر صاحب کا پوچھا تو معلوم ہوا کہ اُس وقت وہ گھر آرام فرما رہے ہیں۔ ''یہ کیا بات ہوئی؟ ابھی تو بمشکل صبح کے دس بجے ہوں گے!'' میں نے پوچھا۔ معلوم ہوا ڈاکخانے کا قانون یہی تھا کہ پوسٹماسٹر صاحب کے منقسم اوقاتِ کار ہوا کرتے ہیں۔ اُنہیں چونکہ اپنے خزانچی کے ہمراہ صبح چھ بجے خزانہ کھولنا پڑتا ہے۔ اُس کے بعد چھوٹے ڈاکخانوں کیلئے ڈاک کی ترسیل ہوتی ہے جس کے ساتھ ہی رقومات بھی بھیجی جاتی ہیں۔ اور اسی طرح مختلف میل لائنوں سے ڈاک آتی بھی ہے۔ لہذا چار گھنٹے کام کرنے کے بعد وقفہ کیا جاتا ہے اور پھر بارہ بجے سے جبتک پوسٹماسٹر صاحب اپنے دفتر کا حسابِ آمدن و خرچ ملا نہیں لیتا، ڈیوٹی پر حاضر رہتا ہے۔ لیجئے یہ ہوا اس نئی ملازمت میں پہلا سبق۔

پوسٹ ماسٹر صاحب جب تشریف لائے تو وہ مجھے ملحقہ ریسٹ ہاؤس میں لے گئے۔ معلوم ہوا ہر ضلعی ڈاکخانے کے ساتھ ایسی سہولت موجود ہے جسے انسپکشن کوارٹر کہا جاتا ہے اور جہاں معائنے پر آنے والے افسران قیام کرتے ہیں۔ پوسٹ آفس کا یہ انسپکشن سسٹم دراصل اس کے سارے عملے کو چوکس اور مُستعد رکھنے کیلئے ایک نایاب نُسخہ ہے۔ جہاں پر یہ نظام کمزور ہوا وہیں پر ہزار قسم کی قباحتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ ایک پیالی چائے پلانے کے بعد میرے سامنے اُنہوں نے دس عدد ضخیم کتابیں رکھ دیں۔ یہی کتابیں ڈاک کے سارے اصول وضوابط کی امین بتائی گئیں اور اِن کو پڑھ کر اور ساتھ ساتھ ڈاک کے ہر صیغہ کار کا عملی جائزہ لے کر ہی میں نے ایک تجربہ کار افسرِ نامہ براں بننا تھا اور میری پروبیشن تب ہی ختم ہوتی جب میں ان کتابوں کے مندرجات سمجھ کر محکمانہ تحریری امتحان پاس کرلوں۔

اب تو یہ روز کا معمول بن گیا۔ صبح مقررہ وقت پر ہیڈ پوسٹ آفس جاتا۔ ریسٹ ہاؤس جانے سے پیشتر ایک نہ ایک صیغہءِ خدمت کے کارندوں سے اُن کے متعلقہ شعبے کے گُر دریافت کرتا اور اُنکو کام کرتے دیکھتا، بے شمار سوال پوچھتا۔ کچھ بات سمجھ میں آتی اور کچھ چیزوں کے متعلق بعد میں کتاب دیکھتا۔ کچھ حضرات تو فرما دیتے ''ارے صاحب رہنے بھی دیں۔ کُرسی سب کچھ سمجھا دے گی''۔ اتنی بات تو فوراً سمجھ میں آ گئی کہ ڈاکخانے میں بے شمار خانے ہیں۔ پوسٹماسٹر صاحب تشریف لاتے تو ریسٹ ہاؤس جا کر سامنے واقع روز گارڈن کے چھوٹے سے کھوکے سے

دودھ پتی اور حلوہ منگوا کر روزانہ کی پروگریس پر بات ہو جاتی۔ تیسرے مہینے ایک روز خبر آئی کہ سُپر یٹنڈنٹ ڈاکخانہ جات ڈیرہ اسماعیل خان سے آ رہے ہیں۔ اُن کی عملداری میں اُس وقت کے تین اضلاع ڈیرہ، بنوں اور کوہاٹ کے علاوہ شمالی اور جنوبی وزیرستان کی قبائلی ایجنسیاں بھی تھیں۔ ان میں واقع سب ڈاکخانوں کا انتظام وانصرام اور مقرر شدہ انسپکشن کرنا اُن کے فرائضِ منصبی میں شامل تھا۔ اور اس ذمہ داری میں اُن کے سب ڈویژنل انسپکٹر اور ہیڈ پوسٹماسٹر اُن کا ہاتھ بٹاتے تھے۔ ڈویژنل سپرنٹنڈنٹ عنایت اللہ خان نہ صرف اپنے کام کے کھرے تھے بلکہ تعلقاتِ عامہ کا شعبہ اُن کا خصوصی میدان تھا لہذا جہاں بھی جاتے وہاں کی سب ہی اہم شخصیات سے ملاقات ضرور کرتے اور یہی کچھ اُنہوں نے اُس روز بنوں آ کر بھی کیا اور مجھے بھی سب افسرانِ ضلع سے متعارف کرایا۔

آئی۔یو۔خان

چار ماہ بنوں ہیڈ آفس میں گزارنے کے بعد اپنی تربیت کے دوسرے مرحلے پر ڈویژنل ہیڈ کوارٹر ڈیرہ اسماعیل خان میں عنایت اللہ خان صاحب کے ساتھ ہی منسلک کر دیا گیا۔ وہ محکمہ بھر میں آئی۔یو۔خان کے نام سے جانے پہچانے جاتے تھے۔ رمضان شریف کا مہینہ تھا۔ میری رہائش کا انتظام ہیڈ پوسٹ آفس میں واقع انسپکشن کوارٹر میں ہوا۔ اللہ ڈیوایا بلوچ کی خدمات بطورِ خانساماں کے میرے حوالے کر دی گئیں لیکن سحری خانصاحب کے گھر سے ہی آتی تھی۔ خانصاحب اور بھابی کی یہ خصوصی عنایت ہمیشہ یاد رہیگی۔ دونوں میاں بیوی اولاد کی نعمت سے محروم تھے اور اپنی ساری محبتوں کو اپنے تین عدد پالتو کُتوں نومی، فومی اور پومی پر نچھاور کرتے۔ وہ دن بھی کیا اندوہناک دن تھا جب اُن کا ایک عدد کُتا جہانِ فانی کو خیر باد کہہ گیا۔ میاں بیوی نے باقاعدہ اُس کی تدفین فرمائی اور ہم سب نے دونوں سوگواروں سے بھرپور تعزیت کرنے کا فرض ادا کیا۔

یہاں میرا اہم کام ڈویژنل سُپر یٹنڈنٹ سے ڈاک دفاتر کے معائنے کے طور طریقے سیکھنا ٹھہرا۔ خان صاحب اپنے سٹینو اور اردلی کے ساتھ ساتھ اب مجھے بھی ہر دورے میں ساتھ رکھتے۔ اُن کی واکس ہال کار ہمارے لئے کافی تھی۔ ہر معائنے کے موقع پر مجھے بہت کچھ سیکھنے کو مل جاتا۔ کولاچی جانے لگے تو پینے کے پانی کا خاص انتظام کیا گیا کیونکہ بقول خان صاحب اُس علاقے کا پانی پینے سے جسم میں ''نارو'' نامی موذی بیماری ہو جانے کا احتمال ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ انسپکشنز کے لئے محکمے کے دیئے ہوئے کافی طویل سوالنامے کے خان صاحب بذاتِ خود حافظ ہیں اور اُسے دیکھے بغیر بڑی مہارت سے اپنا کام سرانجام دیتے رہتے ہیں۔ ایک روز

علاقہ پہاڑ پور کے گاؤں جھاڑ جانا ہوا۔ یہاں ایک حضرت اپنے سیونگز بینک اکاؤنٹ سے ڈبل رقم نکلوانے کے چکر میں تھے۔اس سلسلے میں اُس نے اپنے گاؤں کے ڈاکخانے کے پوسٹماسٹر پر غبن کا الزام لگایا تھا جو وہاں کے ایک دینی مدرسے کا طالب علم تھا۔روپے کی لالچ نے متعلقہ کھاتہ دار جو اچھا خاصا زمیندار تھا، کو بالکل اندھا کر دیا تھا۔اوپر سے اُسکا نوجوان لالچی بیٹا سیدھے سادھے پوسٹماسٹر پر الزام پہ الزام لگا رہا تھا۔ بات اتنی سی تھی کہ دفتری لیجر کے مطابق تو وہ حضرت اپنی رقم نکلوا چکے تھے لیکن کسی طرح اس بات کا اندراج اُس کے ذاتی پاس بُک میں ریکارڈ نہ ہو سکا تھا۔ خانصاحب نے پہلے تو گواہوں کے بیانات قلم بند کرائے۔ اُس سے بات نہ بنی تو دعوے دار اور پوسٹماسٹر کو مسجد لے جا کر قسم اُٹھانے کو کہا۔اس سے مسئلہ حل نہ ہوا تو انہوں نے اپنے انسپکٹر کو علاقے کے پٹواری کے پاس بھیجا اور ساتھ ہی آڈِٹ آفس لاہور سے کھاتے کے متعلق معلومات منگوائیں۔ دو روز بعد یہ راز فاش ہوا کہ لیجر اندراج کے مطابق جس دن کھاتہ دار نے رقم نکلوائی ہے اُسی روز اُس نے ایک قطعہ زمین کا سودا مکمل کیا ہے۔آڈٹ آفس سے آئے ہوئے ادا کردہ رقم کے ووچر سے دعوے دار مذکور کے نشانِ انگوٹھا اور گواہ کے دستخط کی بھی تصدیق ہوگئی۔ یوں مقدمے کا رُخ ہی بالکل بدل گیا۔

خانصاحب کے ساتھ سب سے دلچسپ سفر جنوبی وزیرستان کے صدر مقام وانا کا تھا۔ میں اور خانصاحب پہلے اُن کی گاڑی میں ٹانک گئے۔ پیچھے اُن کا عملہ علیٰحدہ سے پہنچا۔ رات وہاں ڈاک بنگلے میں ساری رات خانصاحب اپنے کیمپ بیگ سے آئی ہوئی فائلیں دیکھتے رہے۔اور میں انگیٹھی میں رکھی ہوئی لکڑیوں کو جلتا دیکھتا رہا اور ساتھ ہی ساتھ انگیٹھی کے اوپر لٹکی ہوئی ایک فریم شدہ نظم پڑھتا رہا۔ یہ نظم کسی دل جلے نے ''ٹانک کے مچھر'' کے عنوان سے لکھ کر ایک حقیقت کی بھرپور ترجمانی فرمائی تھی۔اس نظم کی تعریف اس سے قبل رات کے کھانے پر خانصاحب کے دوست اور تحصیل ٹانک کے اسسٹنٹ کمشنر شاہد حُسین کے ہاں سُن چکا تھا۔ صبح ہوئی تو خان صاحب جنوبی وزیرستان کے پولیٹیکل ایجنٹ کیپٹن عمر آفریدی کے ہاں جا پہنچے اور اُن سے فوری طور پر ''بدرگہ'' (مقامی باڈی گارڈ دستہ) کی فرمائش کی۔ پولیٹیکل ایجنٹ جو سردیوں میں ٹانک کو بطور سرمائی صدر مقام استعمال کرتے تھے۔ اُنہوں نے جنڈولہ سکاؤٹس سے بدرگہ لینے کا مشورہ دیا۔لیکن خان صاحب بضد تھے کہ وہ ایک سویلین افسر ہوتے ہوئے فوجیوں کا بدرگہ استعمال نہیں کریں گے۔ اس سلسلے میں اُنہوں نے میرے کسی بھی مشورے کو یہ کہہ کر قابلِ توجہ نہ سمجھا کہ آپ کو یہاں سے بدرگہ لے جانے کے فوائد کا کیا علم ہے؟۔اور شاید بات تھی

بھی ایسی ہی۔ کافی بحث و تحمیص کے بعد بدرگہ کے چھ عدد جوان بمع ایک عدد لاری کے ہمارے حوالے کر دئے گئے۔ خان صاحب نے فوراً اپنے سارے عملے کو بمع اپنے اپنے گرم بستروں اور سامان کے اس لاری میں بیٹھنے کا حُکم صادر فرما دیا۔ اس عملے میں اُنکے سٹینو اور اَردلی کے علاوہ متعلقہ سب ڈویژن کا انسپکٹر پوسٹ آفسز، اُسکا اَردلی اور پوسٹل لائف انشورنس کا انسپکٹر شامل تھا۔ پولیٹیکل ایجنٹ سے اُنکے تکرار کے اولین فائدے کا تو مجھے فوراً ہی علم ہو گیا۔ ہمارا قافلہ جنڈولہ اور منزئی سے گزرا تو دونوں دفاتر کا معائنہ بھی ہوا۔ آگے ایک جگہ سر بفلک پہاڑوں کی چوٹی کے قریب پہنچنے ہی والے تھے کہ خانصاحب نے اچانک گاڑی روک لی۔ تھوڑی دیر پہلے وہ انہی پہاڑوں کے درمیان قبائلیوں کی جانب سے سڑک بند کرنے کی بات کر رہے تھے۔ جب ایک بار پیشتر وہ اپنی گاڑی میں اپنی بیگم کے ہمراہ یہاں سے گذر رہے تھے اور یہ کہ بدرگہ کی موجودگی کی وجہ سے ہی کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا۔ میں نے اب رُکنے کا سبب معلوم کرنا چاہا لیکن خان صاحب گاڑی سے اُتر کر پیچھے ڈگی سے اپنی ڈبل بیرل بندوق نکال چکے تھے اور اندھا دھند فائر بھی کر چکے تھے۔ دوسری جانب سے میں اُترا تو مسکرا کر فرمایا "یہاں پرندوں کا اچھا شکار مل جاتا ہے اور تمہاری بھابی بغیر شِکار کا گوشت لائے مجھے گھر نہیں آنے دیتیں"۔ لیکن یہ آپ کے شکار کردہ پرندوں کو ان گہری گھاٹیوں میں کون ڈھونڈے گا، اور کون ذبح کرے گا"؟ میں نے پوچھا۔ اِتنے میں بدرگہ کی لاری آ پہنچی اور اُس سے سیاہ پگڑیوں سے اپنے چہرے ڈھانپے جوان خود بخود کود پڑے اور تھوڑی ہی دیر میں کوئی چوبیس پرندے خان صاحب کی خدمت میں پیش کر دئے۔ خان صاحب مُسکرا کر فرمانے لگے، یہ ہوا فائدہ نمبر دو '۔

خان صاحب کو تیز ڈرائیونگ کا بھی شوق تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ہم نیچے وادی میں ایک بہتی ہوئی سیلابی ندی میں سے گزر رہے تھے کہ پانی کے عین درمیان میں گاڑی پہنچ کر رُک گئی۔ اب کیا ہوگا؟ میں نے پوچھا۔ "آپ صبر سے کام لیجئے۔ وہی ہوگا جو منظورِ خدا ہوگا"۔ چند لحموں میں بدرگہ والے ہماری گاڑی کو سیلابی ریلے سے نکالنے میں کامیاب ہو گئے اور خان صاحب نے ایک فاتحانہ مُسکراہٹ کے ساتھ فرمایا۔ "فائدہ نمبر تین"۔ وانا پہنچے تو فوجی میس میں جہاں وہ بُکنگ کرا چکے تھے، اپنا سامان پہنچانے کا کہہ گئے اور ساتھ ہی بدرگہ والوں کو بیس (20) روپے کے نوٹ دیتے ہوئے فرما گئے۔ "یہ ہوا تمہارا کھانا۔ اب ہر جوان کم از کم ایک ایک من لکڑی میس پہنچا آئے"۔ دسمبر کا مہینہ تھا اور سردی کی وجہ سے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ میس کے ایک کمرے میں گرم انگیٹھی کے سامنے بیٹھ کر

گرم چائے کے گھونٹ بھرنے سے پہلے ہی مجھے ٹانک سے بدرگہ لانے کے سارے فوائد سمجھ آ گئے۔

خان صاحب شکار کے رسیا ضرور تھے لیکن کسی انسان کے دل کو ذرا سی ٹھیس پہنچانے کے وہ ہرگز متحمل نہیں ہو سکتے تھے۔ اپنے نچلے سٹاف کے کئی افراد کے بچوں کی تعلیم کی ذمہ داری اور بوقتِ ضرورت اُن کی بچیوں کی شادی کے اخراجات برداشت کرنے کی حامی وہ اکثر بھر لیتے تھے۔ ایک دفعہ اُن کے ساتھ کوہاٹ کی تحصیل ہنگو کے چند پوسٹ آفسز کی انسپکشن کرنے گئے تو اُنہیں کسی نے ایک ریٹائرڈ میجر صاحب کے قائم کردہ مامنِ طیور (برڈ سینکچوری) کے متعلق بتایا۔ خان صاحب فوراً میجر صاحب سے ملنے پر مُصر ہو گئے۔ وہ حضرت اگرچہ خاصے مشکل قسم کے انسان مشہور تھے لیکن خانصاحب نے بکمالِ فن اُنکو اپنے شیشے میں اُتار لیا۔ وہ خود ہی ہمیں اپنی امن گہہ طیور میں لے گئے اور خانصاحب کو اپنا شوق پورا کرنے کی بھی اجازت دے دی۔ پہاڑوں کے درمیان ایک وسیع و عریض خطہ زمین پر سینکڑوں سرسبز درختوں کے درمیان لاتعداد پرندوں کی مسحور کُن چہچہاہٹ واقعی ایک حسین منظر تھا۔ خانصاحب ہاتھ میں اگرچہ بندوق تھامے ہوئے تھے لیکن بغیر ایک بھی فائر داغے گیمز ریزرو کی سیر کر کے آ گئے۔ میجر صاحب کا شکریہ ادا کیا اور اُن کا دل دُکھانے کی بجائے اُن سے ہمیشہ کی دوستی قائم کر لی۔ اس موقع پر میں نے میجر صاحب سے یہ امن گاہ قائم کرنے اور اس کو محفوظ رکھنے کے لئے مختلف جتن کرنے کے بارے میں سوال کیا تو فرمانے لگے۔ ''بھئی میں نے تو خاص کچھ نہیں کیا، سوائے اس کے کہ نہ کبھی کوئی درخت خود کاٹا اور نہ یہاں کسی کو آنے والے پرندوں اور جانوروں پر بندوق اُٹھانے دی۔ اس جگہ کی آبادی خود بخود بڑھتی گئی''۔ صوبہ سرحد کے اس علاقے میں جہاں اسلحہ بنانا ہی ایک گھریلو دستکاری سمجھی جاتی ہے یہ سب کچھ کرنا خاصا مشکل کام تھا۔

ویسے دریائے سندھ کے کنارے واقع ڈیرہ اسماعیل خان کا تاریخی شہر ''اپنی نوعیت آپ'' کی دستکاریوں کا مرکز شمار کیا جاتا ہے۔ یہاں نہ صرف مشہورِ زمانہ سوہن حلوہ بنتا ہے بلکہ لکڑی سے بنے ہوئے مختلف النوع صنائع اپنی مثال آپ ہیں۔ شاید اسی وجہ سے اُنہی دنوں آسٹریلین ماہرین پر مشتمل ایک ٹیم ہمارے دوست انعام اللہ جان کے ہمراہ ڈیرہ آئی جو ایران کے عظیم حُکمران دارا کے اُس سترہویں صوبے جو آجکل کے پاکستان کے شمالی اور مغربی حصوں پر مشتمل تھا، کے تاریخی، ثقافتی اور تہذیبی آثار کے جمع کرنے اور اِن مٹتی ہوئی انسانی کاوشوں کی تصاویر اور وڈیو بنانے پر مامور تھی۔ ملک کے مشہور ماہرِ آثارِ قدیمہ ڈاکٹر احمد حسن دانی نے یہ فریضہ اپنے شاگرد انعام اللہ جان کے سپرد کیا کیونکہ وہ تاریخ اور آثارِ قدیمہ پر عمیق نظر رکھنے کے علاوہ صوبہ سرحد میں بولی جانے والی قدیم اور جدید

زبانوں سے بھی آشنا تھا۔ بدقسمتی سے وہ ڈیرہ کی عوامی زبان سرائیکی سے قطعاً نابلد تھا۔ لہٰذا اُسکی درخواست پر ہم نے اللہ ڈیوایا بلوچ کو اس کام میں مدد دینے کیلیئے ٹیم کے سپرد کر دیا۔ غیر ملکیوں کی سہولت کی خاطر اُس دن سے اُسکا نام اے۔ ڈی۔ بلوچ ہو گیا۔ اس شریف آدمی کو جو یومیہ ملتا تھا اُسکا آدھا وہ اپنی فلم بینی کے شوق کو پورا کرنے میں صرف کر دیتا تھا۔ ہمارے دیگر دوست جن میں انجینئر ظفر بیگ بھٹّی اور صاحب نواز خان جو اُس وقت ڈیرہ زرعی بینک کے مینیجر تھے، بھی اس ٹیم کی ہر طرح سے مدد کرتے رہے اور ایک چاندنی رات تو آئی۔ یو۔ خانصاحب کی میز بانی کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہم سب نے دریا کے کنارے پکنک منائی۔ واضح رہے کہ قراقرم کے سلسلہ کوہ سے تنگ دامن نکلتا ہوا یہ دریا ڈیرہ اسماعیل خان کے پاس آ کر اپنی چوڑان کی انتہا پر پہنچ جاتا ہے۔

ریلوے میل

مارچ 1969ء میں جب میں اپنی ٹریننگ کے تیسرے مرحلے میں ریلوے میل سروس کے ایک ڈویژن کے ساتھ منسلک ہوا تو راولپنڈی آنا ہوا۔ اُن دِنوں مُلک کے مردِ آہن صدر فیلڈ مارشل ایوب خان اپنی حکومت اور دورِ اصلاحات کی دس سالہ برسی منا چکے تھے۔ سیاسی قوتوں کا پیمانہ صبر پہلے ہی چھلک چکا تھا اب عوام کی بے صبری اُس وقت بے قراری میں تبدیل ہو گئی جب اچانک چینی کی قیمتیں اُن کی قوتِ برداشت سے باہر ہونے لگیں۔ مزے کی بات یہ تھی کہ اُس وقت کے وزیرِ خوراک ایشیاء کے سب سے بڑے چینی کے کارخانے کے مالک سمجھے جاتے تھے۔ اُن کو تو ''چینی چور'' کا لقب ہی دے دیا گیا۔ ہر طرف ہڑتالیں اور تالہ بندیاں شروع ہو گئیں تو ڈاک اور تار کے ملازمین نے بھی ان میں بھرپور حصہ لیا۔ میں راولپنڈی پہنچا تو راولپنڈی جنرل پوسٹ آفس فوج کے حوالے ہو چکا تھا اور تقسیم ڈاک کیلیئے قائم ڈیلیوری ہال میں پوسٹماسٹر کی کُرسی پر سگنل کور کے ایک لفٹننٹ صاحب براجمان تھے۔ افسرانِ ڈاک تو ہڑتال پر نہیں تھے لہذا ہر کوئی ڈاک کی ترسیل اور تقسیم کو یقینی بنانے کی اپنی سی کوشش میں مصروف تھا تا کہ اسلام آباد اور راولپنڈی میں خصوصاً اور ملک بھر میں عموماً ڈاک کی سہولیات برقرار رکھی جا سکیں۔

عبدالخالق اعوان ریلوے میل سروس (آر۔ایم۔ایس) کے ''آر'' ڈویژن کے ڈویژنل سپرینٹنڈنٹ تھے۔ فیاض اختر (مرحوم) اُس وقت اسلام آباد اور راولپنڈی وفاقی خطے کے کنٹرولر پوسٹ آفسز کی حیثیت سے خدمات انجام دے رہے تھے۔ فیاض اختر صاحب کی فیملی چونکہ لاہور میں تھی لہذا وہ اعوان صاحب کے بنگلے میں اُنکے پاس رہائش پذیر تھے۔ میں آیا تو اعوان صاحب نے مجھے بھی اپنے گھر میں مہمان رکھ لیا۔ پڑوس میں

کشمیر ڈویژن کے سپرنٹنڈنٹ طارق فیض صاحب رہا کرتے تھے۔ کچھ تو کام سے لگاؤ اعوان صاحب کی فطرتِ ثانیہ تھی اور کچھ ملازمینِ ڈاک کی مکمل ہڑتال کے باعث اُنکی ذمہ داریاں کئی گنا بڑھ گئی تھیں۔ وہ صبح سویرے دفتر چلے جاتے اور رات کافی دیر سے واپس آتے۔ ایک صبح جو ناشتے کی میز پر ملاقات ہوئی تو پوچھا ''میرے ساتھ پشاور چلو گے؟'' میں نے کہا ''بالکل چلوں گا''۔ ''تو پھر شام کو تیار رہنا''۔ اُنہوں نے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے ارشاد فرمایا۔ لہذا میں نے اُنکے خانساماں مسکین سے شام کو کھانا جلد لگانے کیلئے کہا۔ کھانا بھی کھا لیا لیکن اعوان صاحب کا کوئی اتا پتا معلوم نہ ہوسکا۔ تھوڑی دیر بعد آنکھیں بوجھل ہوئیں تو بستر پر لیٹ گیا۔ آدھی رات کو ٹھیک 12 بجے مسکین نے جگاتے ہوئے بتایا کہ اعوان صاحب نے گاڑی بھجوائی ہے۔ آپ ریلوے سٹیشن جانے کیلئے تیار ہو جایئے۔ ''ارے بھائی شام کا مطلب رات کے 12 بجے کب سے ہو گیا؟'' میں بڑبڑایا۔ بہر حال آنکھیں ملتے ہوئے سٹیشن کی راہ لی۔ معلوم ہوا صبح کے 2:30 بجے خیبر میل میں عازمِ پشاور ہونا قرار پایا ہے۔ ریل گاڑی میں سوار ہونے کیلئے روانہ ہوئے تو دیکھا کافی ساری بڑی بڑی ٹرالیاں ڈاک کے تھیلوں سے لدی پھندی ہیں جن کو پلیٹ فارم پر باوردی عملہ کھینچے لئے جا رہا ہے۔ ان میں ایک ٹرالی والے کارندے جنہیں ریلوے میل کی اصلاح میں ''پورٹر'' کہا جاتا ہے، دوسرے ساتھیوں کو یہ کہتے ہوئے راستہ دینے کو کہہ رہے تھے، ''ہٹو ہٹو! صاحب بہادر کا سامان پہلے جائے گا''۔ ''آپ کے صاحب ہونے کے متعلق تو میں جانتا ہوں لیکن یہ لوگ کیا جانے کہ آپ ''بہادر'' بھی ہیں''۔ میں نے اعوان صاحب سے دل لگی کرتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ لقب اپنے وقت پر تمہیں بھی مل جائے گا''۔ اعوان صاحب نے جواب دیا۔ ''واقعی آپ کی طرح دن رات ایک کر دوں تو پھر ''بہادر'' ہونے میں کیا شبہ رہ جائیگا''، میں نے گرہ لگائی۔

اب تو اعوان صاحب کے ساتھ لال ڈبے میں آنا جانا روز کا معمول بن گیا۔ کبھی متحرک ڈاک کے دفاتر میں ڈاک کی چھانٹی دیکھی جا رہی ہے اور کبھی زمین پر قائم میل اینڈ سارٹنگ آفسز کی انسپکشن ہو رہی ہے۔ ہر سفر بالعموم رات کو ہی ہوتا تھا تا کہ جہاں تک ہوسکے منزلِ مقصود پر ڈاک کی تقسیم کو علی الصباح یقینی بنایا جا سکے۔ حویلیاں یا ایبٹ آباد کیلئے جاتے تو راولپنڈی سٹیشن سے 3:30 بجے صبح روانہ ہوتے۔ کوہاٹ کی ٹرین رات پونے دس بجے پکڑتے اور صبح چار بجے کوہاٹ پہنچ کر میں صبح کا ناشتہ کیڈٹ کالج میں اپنے دیرینہ ساتھیوں کے ہمراہ کر لیتا۔ کُندیاں، ماڑی انڈس اور لکی مروت سے ہوتے ہوئے چھوٹی سی پٹڑی پر چلنے والی ٹرین سے بنوں بھی ہو آتے۔ یہ

آر۔9 نامی سیکشن اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے کیونکہ ماڑی اور بنوں کے درمیان اب ریلوے پٹڑی ختم کر دی گئی ہے۔اس سلسلے میں ایک دن بنوں ریلوے سٹیشن پر گاڑی کی روانگی سے قبل ٹہلتے ہوئے میں نے اعوان صاحب سے پوچھا۔''ہماری پوسٹل سروس میں آگے ترقی کے مواقع کیسے ہیں؟'' فرمانے لگے۔''پہلے تو بہتر تھے اب بالکل معدوم ہو گئے ہیں کیونکہ ہم سے آگے ہمارے افسر بالکل ہمارے ہی ہم عمر نظر آتے ہیں''۔ اُنکی یہ قنوطیت بھری سوچ کافی پریشان کُن تھی۔ اُن کا کہنا تھا کہ ہم سب صرف ایک درجہ اوپر جانیکے بعد ریٹائر ہو جائیں گے۔ بعد میں اعوان صاحب سیکرِٹیریٹ سروس میں گئے تو قواعد وضوابط میں اپنی مہارت کا سکّہ بطورِ ڈپٹی سیکرٹری ایسٹیبلشمنٹ ڈویژن میں منوا گئے۔خدا جانے وہ وہاں سِول ملازمین کی کیریئر پلاننگ کس انداز میں کرتے رہے ہونگے۔لیکن ایک بات واضح ہو گئی کہ مستقبل کے متعلق پیش گوئی ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ وہ خود اعلیٰ ترین عُہدوں پر پہنچے۔ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل بنے اور پھر نئے تشکیل شدہ ٹیلی کمیونیکیشن اتھارٹی کے ممبر ایڈمنسٹریشن رہے، اور پوسٹل سروس جو بعد میں پوسٹل گروپ کہلائی میں بھی ہم خادمین کو خاصی ترقی کے زینے عبور کرنے کو ملے۔

آمریت سے آمریت

اس عرصے میں ملکی سطح پر کیا ہوتا رہا وہ بھی ہماری اُس تاریخ کا حصہ بن چکا ہے جس سے ہم نے بحثیت قوم کوئی سبق حاصل نہیں کیا۔فیلڈ مارشل ایوب خان کی صدارت کا ''درخشندہ باب'' اُس وقت ختم ہوا جب وہ اپنی دورِ ترقی کا دس سالہ منا چکے تھے اور عوامی احتجاج کا نہ رُکنے والا رَیلا اُن کی خرابیِ صحت پر منتج ہوا اور ایک فوجی آمریت نے دوسری فوجی آمریت کو جگہ دی۔اس نئے فوجی جُنتے کا سالار جنرل یحیٰی خان تھا۔اُس نے صاف اور شفاف غیر جانبدارانہ انتخابات کرانے کی حامی بھری اور اس دعوے میں کسی حد تک کامیاب بھی رہا لیکن نیک نامی اُسکے مقدر میں ہی نہیں تھی۔ 1971ء کے عام انتخابات میں مشرقی اور مغربی پاکستان دونوں بازوؤں سے دو مختلف سیاسی پارٹیاں کامیاب ہوئیں۔ بنگالیوں نے مشرقی پاکستان میں 97% اکثریت سے عوامی لیگ اور اُسکے رہنما شیخ مجیب الرحمان کے حق میں ووٹ دیئے۔جبکہ مغربی پاکستان میں عوام نے تقریباً اتنی ہی اکثریت سے ذوالفقار علی بُھٹو کی پیپلز پارٹی کو کامیابی سے ہمکنار کیا۔دونوں سیاسی رہنماؤں میں مستقبل کی حکومت کے بارے میں کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا یا یوں کہیے دونوں کو ایسا کرنے ہی نہیں دیا گیا۔ملک کے دُشمنوں نے اس نااتفاقی کا بھرپور فائدہ اُٹھایا اور بالآخر 16 دسمبر 1971ء سے ملک کے دونوں حصوں کی راہیں جُدا قرار پائیں۔

تسخیرِ ماہ و انجم

ہم اپنے بزرگوں کی اَن گنت قربانیوں سے حاصل کیے ہوئے ملک کو یکجا نہ رکھ سکے۔ اُدھر حضرتِ انسان بقولِ علامہ محمد اقبالؒ ستاروں پر کمندیں لگانے کی جدوجہد میں مصروف تھا۔ یہ رہ نوردِ شوق، خلا کی تسخیر کیلئے پہلا قدم 14 اکتوبر 1957ء کو اُٹھا چکا تھا جب روسی سائنسدان اپنا پہلا مصنوعی سپٹنک اوّل سیّارہ خلا میں بھیجنے میں کامیاب ہوئے۔ جلد ہی 3 نومبر 1957ء کو اُنہوں نے ''لائکہ'' نامی کُتیا کو بھی اسپٹنک دوم میں بھیج کر پہلا خلائی جاندار بنا دیا۔ اگرچہ ''لائکہ'' زندہ سلامت واپس نہ آسکی لیکن پھر 2 اگست 1960ء کو اسپٹنک پنجم کے ذریعے دو کتے ''بیلکا'' اور ''سٹریلکا'' 24 گھنٹے خلاء میں رہنے کے بعد بہ سلامت زمین پر واپس آ گئے۔ پہلا خلائی انسان ہونیکا شرف روسی سائنسدان یوری گیگارن کو 12 اپریل 1961ء کو حاصل ہوا۔ یوں ہوتے ہوتے امریکی صدر جان۔ ایف۔ کینیڈی نے چاند کو ''آدم خاکی'' کے پاؤں تلے لانے کی طرف توجہ دی اور پھر 20 جولائی 1969ء کو ''اپالو۔II'' مصنوعی سیارے کی جلو میں امریکہ کے ''نیل آرم سٹرانگ'' کے چاند پر قدم رکھنے سے مفکرِ پاکستان کی یہ پیش گوئی کہ

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہہ کامل نہ بن جائے

لفظ بہ لفظ پوری ہوتی دکھائی دی۔ لیکن ہمارے ناخلف سیاستدانوں کے ہاتھوں اُنکا دیرینہ خواب ''پاکستان'' بکھرتا نظر آنے لگا۔ ملک سُکڑنے لگا لیکن بیوروکریسی کا امتداد مزید پھلنے پھولنے لگا۔

اُن ہی دنوں ایک روز اعوان صاحب کے ایک عزیز سرگودھا سے تشریف لائے۔ مجھ سے کہنے لگے۔ دُنیا بھر سے سکھ یاتری پنجہ صاحب کے سالانہ میلے میں آئے ہوئے ہیں، چلو حسن ابدال ہو آتے ہیں شاید سرگودھا کے رہنے والے کسی یاتری سے ملاقات ہو جائے۔ پنجہ صاحب پہنچے تو جس پہلے سردار جی سے ملاقات ہوئی اُس سے اعوان صاحب نے پوچھا۔ ''سردار جی، کوئی سرگودھے کا سردار بھی آپ کے جتھے میں آیا ہے؟'' اُس نے برجستہ جواب دیا۔ ''حضور سرگودھا تو بارڈر کے اِس پار ہے ہم تو اُس پار سے آئے ہیں۔'' دونوں اطراف کی ٹھیٹھ پنجابی گفتگو سُننے سے تعلق رکھتی تھی۔ دونوں حضرات اپنی اپنی جگہ دُرست تھے لیکن بقول شاعر

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزہ کہنے کا جب ہے ایک کہے اور دوسرا سمجھے

سرکل آفس

چوتھے مرحلے میں پوسٹماسٹر جنرل کے دفتر میں کام دیکھنا اور سیکھنا تھا۔ یہ دفتر اب لاہور سے پشاور منتقل ہو چکا تھا۔ اور پشاور یونیورسٹی کی ایک کشادہ عمارت میں قائم کر دیا گیا تھا جسے ''داشاہین جالا'' کہا جاتا تھا۔ اس عمارت کی تاریخی اہمیت یہ تھی کہ پچاس کے عشرے میں امریکہ اور پاکستان کے فوجی معاہدوں کے تناظر میں پشاور کے قریب ''بڈھ بیر'' میں امریکی ائرفورس نے اپنا اڈہ قائم کر رکھا تھا۔ اور یونیورسٹی ٹاؤن میں واقع یہ عمارت امریکی فوجیوں کے کلب کے طور پر استعمال ہوتی تھی۔ 1960ء میں جب ایک یو۔ٹو جاسوسی طیارے کو روسی فضائی حدود میں گرایا گیا تب یہ انکشاف ہوا کہ یہ طیارے بڈھ بیر کے امریکی اڈے سے بلند ہو کر سوویت یونین کے حدود میں جا کر جاسوسی کیا کرتے تھے۔ روس نے اُس وقت اعلان کیا کہ اُنہوں نے پشاور کو نقشے پر سُرخ رنگ سے نشان زدہ کر دیا ہے۔ اس واقعہ کے کچھ عرصے بعد یہ امریکی اڈہ بند کر دیا گیا۔ 1968ء میں پاکستان پوسٹ آفس نے یہ عمارت کرایہ پر لی تو زمینی سطح پر دفاتر کام کرنے لگے اور اوپر والی منزل پوسٹماسٹر جنرل اور دوسرے افسران کیلئے رہائشی سہولت کے طور پر استعمال کی جانے لگی۔ پوسٹماسٹر جنرل میجر بشیر الحسن صاحب، ڈپٹی پوسٹماسٹر جنرل شیخ طفیل صاحب، اسسٹنٹ پی ایم جی فارس رحمان، دو عدد اسسٹنٹ ڈائریکٹر غنی صاحب اور عاشق حُسین اور راقم الحروف سب ہی یہیں رہائش پذیر ہوئے اور مشترکہ طعام و قیام کی سہولت سے مستفید ہوتے رہے۔ سب میں خوردسال ہونے کے ناطے میں میس کا سیکرٹری تھا اور سب بزرگوں کے وسیع تجربے سے بھرپور فائدہ اُٹھاتا رہا۔ میجر صاحب اور دیگر ساتھیوں کی مشفقانہ رفاقت نے مجھے محکمہ ڈاک کی تاریخی اہمیت اور یہاں کی عظیم روایات کو سمجھنے میں بڑی مدد دی۔

سرکل آفس میں تعیناتی کے دوران پوسٹماسٹر جنرل اور اُنکے رُفقاء کی سرکاری طور پر متعین ذاتی ذمہ داریوں سے آگاہی ہوئی۔ اسکے بعد ڈویژنل سطح پر آفس سُپر یٹنڈنٹ راولپنڈی کے دفتر میں بھیج دیا گیا۔ یہاں ایک انتہائی تجربہ کار سُپر یٹنڈنٹ پوسٹ آفسز ملک فضلِ حق کی شاگردی میں رہا اور پھر ٹیلی گراف کی ٹریننگ کیلئے سنٹرل ٹیلی گراف آفس لاہور کے ساتھ منسلک کر دیا گیا۔ چونکہ یہ دفتر مال روڈ پر واقع لاہور جی۔ پی۔ او کے بالمقابل واقع تھا لہذا رہنے کو مجھے جی۔ پی۔ او میں ہی انسپکشن کوارٹر میں ایک کمرہ دے دیا گیا۔ تاریخی شہر لاہور کے قلب میں واقع اس علاقے میں رہتے ہوئے شہر کی جُملہ رُونقوں سے محظوظ ہونے کا بھرپور موقع ملا۔ یہیں ہماری دوستی شیخ بختیار احمد سے ہوگئی۔ جو جی۔ پی۔ او میں اسسٹنٹ چیف پوسٹماسٹر اور عوامی رابطے کے انچارج افسر تھے۔ ناشتہ تو

ہم سامنے واقع وائی۔ ایم۔سی۔اے ہال سے منگوا لیتے تھے لیکن اُس کے بعد شیخ صاحب جو ایک مرنجا مرنج طبیعت کے مالک لیکن دوستوں کے دوست تھے۔ اُن کا دفتر اور اُنکا سکوٹر دِن بھر ہماری میز بانی سے شرف یاب ہوتا رہتا تھا۔ اس کی شاید ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ٹیلی گراف والے 1962ء سے محکمہ ڈاک سے جُدا ہونے کے بعد ہم ڈاک والوں کو کچھ غیر ہی سمجھنے لگے تھے اور ہم بھی اب بقولِ فیض ''مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ'' کے مِصداق اُنہیں زیادہ زحمت دینے سے کترانے لگے تھے۔ بختیار صاحب مرحوم کی معیت میں نہ تو کوئی ادبی و سماجی محفل اور نہ ہی لاہور کا کوئی قابلِ ذکر ریستوران ایسا تھا جہاں ہماری حاضری نہ ہو پائی۔

انسپکٹری

اسکے بعد دو سالہ پروبیشن کے دوران وہ مرحلہ آیا جب زیرِ تربیت افسر کو اپنے طور پر چند ماہ کیلئے مکمل طور پر ایک سب ڈویژن کا چارج دے دیا جاتا تھا۔ میری تعیناتی بنوں پوسٹل سب ڈویژن میں ہوئی۔ اب میرا کام شمالی وزیرستان ایجنسی کے علاوہ بنوں اور کرک تحصیلوں کے تمام چھوٹے چھوٹے ڈاک خانوں کا بندوبست اور ہر ڈاک خانے کا سال میں دو مرتبہ اِنسپکشن کرنا تھا۔ لہٰذا ان دو تحصیلوں اور مذکورہ ایجنسی میں واقع دیہی ڈاک خانوں اور میل لائنز کا انتظام میری ذمہ داری بن گئی۔ یہ دونوں تحصیلیں اب مکمل اضلاع کا درجہ اختیار کر چکی ہیں۔ اکثر دور دراز دیہات میں جانے کیلئے کوئی پکی سڑک موجود نہیں تھی۔ بنوں تحصیل تو میدانی اور سرسبز و شاداب دیہاتوں پر مشتمل ہے لیکن کرک تحصیل کا سارا علاقہ اکثر پہاڑی اور کچھ ریگستانی ہے۔ والد صاحب مرحوم کو اس راہ میں پیش آنے والی مشکلات کا اندازہ ہو گیا اور اُنہوں نے اپنے صابر بیٹے کو پیدل سفر کی کوفت سے بچانے کی غرض سے ایک عدد جیپ خرید کر دی۔ جو پہاڑ، ریگستان اور میدان میں یکساں کار آمد ثابت ہوئی۔ اُن دنوں پٹرول محض 3 روپے فی گیلن مل رہا تھا لہٰذا اس سلسلے میں بھی کوئی دِقت پیش نہ آئی۔ مجھے چونکہ ڈرائیونگ پر ابھی پوری دسترس حاصل نہیں تھی لہٰذا ایک عدد ڈرائیور بھی ملازم رکھا گیا جو میرے اردلی کے طور پر بھی کام انجام دیتا تھا۔ نبی خان نامی میرا یہ ڈرائیور بھی دلچسپ آدمی تھا۔ جب بھی پہاڑی پُر پیچ راستوں کے ساتھ قسمت آزمائی کرتا یا ندی نالوں میں سے ہو کر گزرتا تو مجھے مخاطب کرتے ہوئے فخریہ کہتا۔ ''صاحب اب میں موت کے کنویں میں بھی گاڑی چلا لوں گا۔'' سُپر یٹنڈنٹ صاحب نے یعقوب خان نامی اپنے ایک سابقہ سٹینو کو میرے حوالے کر دیا تھا۔ بے چارہ ایک خطرناک حادثے میں بال بال بچا تھا اور اب صرف گاڑی ہی میں گھوم پھر سکتا تھا۔ اور یہ سہولت اُسے میرے ساتھ بطور گائیڈ کام کرتے ہوئے حاصل

تھی۔ یعقوب خان ایک انتہائی تجربہ کار اور ایماندار انسان تھا لیکن شومئی قسمت اولاد کی نعمت سے محروم تھا۔ لہذا اپنا کام ہی اُسکا اوڑھنا بچھونا بن چکا تھا۔ اچھا خاصا صاحب حیثیت آدمی تھا۔ اُسکی نیک خِصال اور خوش فہم بیوی نے بعد میں اُسکی حالت پر رحم کھا کر اُسکی دوسری شادی کرادی تا کہ معاشرے میں دونوں سکون کا سانس لے سکیں۔ لیکن ایسا ہوتا کب ہے۔ اور معاشرے نے کسی کو پُر سکون رہنے کب دیا ہے۔

بہر حال ہم تینوں گاؤں گاؤں، کچے راستوں، برساتی نالوں، پہاڑی پگڈنڈیوں اور ریگزاروں کی خاک چھانتے رہتے تھے اور دیہی ڈاک خانوں کی نشاندہی کر کے اُن کے اہلکاروں کو مُتعین طریق کار پر کار بند رکھنے کی سعی میں مصروف رہتے تھے۔ ان ڈاکخانوں کے پوسٹماسٹر حضرات عموماً مقامی دکاندار، سکول ٹیچر یا امام مسجد ہوا کرتے ہیں۔ اکثر گاؤں میں داخل ہوتے ہی پہلے ملنے والے شخص سے ڈاکخانے کا حدود اربعہ معلوم ہو جایا کرتا تھا۔ اس عرصہ میں ہر نوع کے انسانوں سے واسطہ پڑا اور ہمارا جغرافیہ کا علم کافی وسیع ہوا۔ عام حالات میں بقول شخصے اللہ میاں کے پچھواڑے ان علاقوں کو دیکھنے کا شاید ہی موقع ملتا۔ لیکن خدا کا شُکر کہ حُکمِ خداوندی ''سیروافی الارض'' کی بجا آوری کی ابتدا ہم نے اِن دور اُفتادہ علاقوں سے کی۔ آج اِن میں سے اکثر دیہات سڑکوں کے جال سے منسلک ہو گئے ہیں۔ لیکن اُس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ ایک جگہ پکی سڑک سے کوئی دس بارہ میل دور ایک اچھے خاصے بڑے گاؤں میں پہنچے تو ایک سفید ریش پوسٹماسٹر صاحب نے حیرت سے پوچھا۔'' آپ آخر یہاں پہنچے کیسے؟ یہاں تو علاقے کا پٹواری بھی نہیں آتا۔ ہم تو اپنے ڈاک خانے کا ریکارڈ انسپکشن کیلئے پکی سڑک پر خود ہی لے آتے ہیں''۔ یہ صورتِ حال اکثر جگہ پیش آئی۔ اور پھر ہم اپنی فور بائی فور جیپسٹر کو سلام اور والد بزرگوارم کی عُمر درازی اور بلندیءِ دَرَجات کی دُعا دیئے بغیر نہ رہتے۔

روپے پیسے کا لین دین قوتِ ایمانی کا بڑا امتحان ہوتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں انسانوں کے اربوں روپے روزانہ ملک بھر کے ڈاک کار پردازوں کے ہاتھوں سے گزرتے ہیں۔ یہاں امانت، دیانت، اور خدمت کا مسلسل امتحان جاری رہتا ہے۔ بحیثیت زیرِ تربیت پوسٹل انسپکٹر جس پہلے برانچ پوسٹ آفس جانے کا اتفاق ہوا وہاں دیکھا کہ پورے نوّے عدد منی آرڈر بغیر تقسیم ہوئے پوسٹماسٹر کے پاس پڑے ہوئے ہیں۔ کسٹمرز حضرات چکر پر چکر کاٹ رہے ہیں اور پوسٹماسٹر صاحب اُنہیں بتا رہے ہیں کہ منی آرڈر آ گیا ہے پر رقم نہیں آئی ہے۔ معلوم ہوا یہ حضرت غلے کے بیوپاری ہیں۔ ساتھ کا کمرہ بطورِ گودام استعمال ہو رہا ہے اور ساتھ ہی ساتھ عوام کا پیسہ اُنکے کاروبار کا سرمایہ بنا ہوا

ہے۔لیکن امانتداری کی درخشاں مثالیں بھی دیکھنے کو بے شمار ملیں۔ایک چھوٹا سا گاؤں ایک پہاڑی کی چوٹی پر واقع تھا۔اپنی گاڑی سے اُتر کر کافی مشکل سے وہاں پوسٹماسٹر کے مکان تک پہنچے تو معلوم ہوا پوسٹماسٹر صاحب گھر پر موجود نہیں۔سارا گھر انتہائی مُنتَشِرّ ع باسیوں پر مشتمل تھا۔تھوڑی دیر بعد پوسٹماسٹر صاحب ہانپتے کانپتے ایک اور دیہاتی کے ہمراہ پہنچے۔معلوم ہوا اس شخص کا گاؤں وہاں سے کوئی چار میل دور واقع تھا اور پوسٹماسٹر صاحب اُس کو وہاں سے لانے گئے تھے کیونکہ اُسکا منی آرڈر آیا ہوا تھا۔ہم نے پوچھا کہ کیا آپ اُسے منی آرڈر کی رقم دے آئے۔کہا،نہیں! میں اسے جانتا نہیں ہوں۔اس نے بتایا کہ وہ اپنی شناخت ثابت کرنے کیلئے ڈاکخانے والے گاؤں کے کسی شخص سے تصدیق کرائے گا۔لہذا ایسا ہی ہوا۔وہ شخص اپنا تصدیق کنندہ لے کر آیا تب ہی اُسے اُس کی رقم مل سکی۔اسطرح پوسٹماسٹر کو آنے جانے کی آٹھ میل کی مسافت تو گلے پڑی لیکن بعد میں سکون سے سونا نصیب ہوا۔

شمالی وزیرستان کے ہیڈکوارٹر میران شاہ جاتے تو احساس ہوتا کہ ہماری فوج کے جوانوں کا ڈاکخانے سے کتنا گہرا تعلق ہے۔اپنے خاندانوں سے رابطے اور اپنے پیاروں کو ہر ماہ اُنکے گھریلو اخراجات کیلئے منی آرڈر ارسال کرنے کیلئے ڈاک اُنکی اُمیدوں کا واحد سہارا ہی تو تھا۔میر علی داوڑ قبائل کا مرکز ہے اُنکے ہاں کا خالص دیسی گھی میں ایک مخصوص انداز سے پکائے ہوئے مُرغی کا گوشت کا سالن ہمیشہ یاد رہیگا۔سرائے نورنگ کے قریب ایک گاؤں کے پوسٹماسٹر نے اپنے حُجرے میں ہر نوع کے گُلاب کے پھولوں کے جُھرمٹ میں ڈاک کا دفتر قائم کیا ہوا تھا۔اور جس خوبصورتی سے اُنہوں نے اپنا ریکارڈ ترتیب دیا ہوا تھا،اُس سے اُنکے ذوق اور لگن کی داد دئے بغیر نہیں رہا جاتا تھا۔معلوم ہوتا تھا اُنکو دو ہی شوق تھے،ڈاکخانہ چلانا اور ہر رنگ کے گلاب کے پودے لگانا۔

ایک پوسٹل سب ڈویژن میں انسپکٹر پوسٹ آفسز کے معاونین میل اوورسیر ہوتے ہیں جن کا خاص کام برانچ پوسٹماسٹروں کی ٹریننگ اور استعداد کار بڑھانا ہوتا ہے۔کیش اوورسیر تمام دیہی ڈاکخانوں کو متعلقہ بڑے ڈاکخانے سے تقسیم کیلئے نقد رقم پہنچاتا ہے۔انسپکٹر جسے آجکل اسسٹنٹ سُپریٹنڈنٹ کہا جاتا ہے،کا زیادہ تر وقت دفاتر کے معائنوں،عوامی شکایات کی تحقیق،نئے ڈاکخانوں کے قیام کے سلسلے میں اِمکانی کام کی نوعیت کا جائزہ لینا اور محل وقوع کے متعلق نقشہ جات کی تیاری کے علاوہ اپنے دائرہ کار میں کام کرنے والے دیہاتی ڈاکیوں (ویلیج پوسٹ مین) اور ہرکاروں (فُٹ رنرز) کی تعیناتی،تبادلوں اور پنشن وغیرہ سب ہی امور کی نگہداشت کرنا اُسکے فرائضِ منصبی میں شامل ہوتا ہے۔اس سطح کے ڈاک اہلکاروں کی شب وروز کی محنت،کام سے لگن اور امانت و

دیانت کے اعلیٰ معیار ہی اس اِدارے کی اصل جان ہوا کرتے تھے۔

ہیڈ پوسٹماسٹر

ضلع بھر کے سب چھوٹے بڑے ڈاکخانوں کا محور و مرکز اور حساب کتاب کا بڑا دفتر **ہیڈ پوسٹ** آفس کہلاتا ہے۔ صرف ملکی دارالخلافے اور صوبائی مراکز کا سب سے بڑا ڈاک دفتر جنرل **پوسٹ** آفس یا جی۔ پی۔ او کہلاتا ہے۔ لیکن عوامی سہولت کی خاطر بعد میں 1985ء سے ہر ضلع کا **ہیڈ پوسٹ** آفس جی۔ پی۔ او کہلانے لگا۔ میری زیرِ تربیت **پوسٹماسٹر** کی حیثیت سے تعیناتی اسلام آباد **ہیڈ** آفس میں ہوئی۔ اُن دنوں اُسکا صدر دروازہ موجودہ میلوڈی مارکیٹ اور فوڈ سٹریٹ کی جانب تھا۔ جبکہ اس کی پُشت اس سے منسوب **پوسٹ** آفس روڈ۔ ارجنٹینا پارک اور پولی کلینک (موجودہ سروسز ہاسپٹل) کی جانب تھی۔ اس عمارت کا رُخ بھی 1985ء کے بعد ہی تبدیل کیا گیا۔ ان دونوں تبدیلیوں کا سہرا اُن دنوں کے اولوالعزم ڈائریکٹر جنرل فاخر حسن کو جاتا ہے۔ لیکن یہ تو 17 سال بعد کی باتیں ہیں۔ اسلام آباد جی۔ پی۔ او میں میری تعیناتی کے وقت تو اسلام آباد شہر صحیح معنوں میں ایک شہرِ خوابیدہ تھا، اسلامی دُنیا کے سب سے بڑے ملک کا صدر مقام جسکے آباد علاقے کا جغرافیہ پاکستان کے دونوں بازوؤں کے دو مشہور تاریخی باغوں کی مناسبت سے دو حصوں میں منقسم تھا۔ جہاں ایک حصہ ''شالیمار'' کہلاتا تھا تو دوسرا ''رمنا'' پکارا جاتا تھا۔ اسلام آباد آج بھی باغوں اور پارکوں کا خوبصورت شہر ہے لیکن اب تجارتی اور صنعتی ترقی اس کی قُدرتی رعنائی کو برقرار رکھنے میں آڑے آ رہی ہے۔

محکمہ ڈاک کے معمول کے مطابق ہر پوسٹماسٹر کو متعلقہ ڈاکخانے ہی کے حدود میں مُفت رہائش دی جاتی ہے۔ تاکہ وہ باسہولت شبانہ روز اپنے فرائض انجام دے سکے۔ خزانے کی دو چابیوں میں سے ایک بحیثیت پوسٹماسٹر میرے پاس جبکہ دوسری چابی ہمارے خزانچی ''ارشاد'' کے پاس ہوتی تھی۔ لہذا ارشاد صاحب علی الصباح جوں ہی دروازے پر لگی ہوئی گھنٹی پر اُنگلی دباتے تھے، میں اپنے گرم بستر سے اُچک پڑتا تھا۔ اتفاق سے میرے قیام کے یہ چار مہینے اسلام آباد کے سرد ترین مہینوں پر مشتمل تھے۔ جی۔ پی۔ او ہی میں اہلکاروں کی تربیت کیلئے پوسٹل ٹریننگ سنٹر قائم تھا۔ جسمیں شمال مغربی منطقے کے ہر ضلعے سے پوسٹ آفس اور ریلوے میل سروس کے سب اہلکار آ کر مختلف موضوعات سے متعلق ٹریننگ حاصل کرتے تھے۔ اس سنٹر کے پرنسپل حافظ رشید صاحب انتہائی سُلجھے ہوئے انسان تھے جن کے ساتھ محبت واحترام کا رشتہ قائم کئے بغیر چارہ نہیں تھا۔ تقسیمِ ڈاک کے شعبے

کے انچارج اسسٹنٹ پوسٹماسٹر کو سب پوسٹ مین پیار سے ''جو.جی ماسٹر'' پکارتے تھے۔ جبکہ اکاؤنٹس کی پیچیدہ گُتھیاں حل کرنا راجہ رحمت صاحب کی ذمہ داری تھی۔ اُنہیں ڈاک خانے کا سب ہی عملہ ''رحمت'' کم اور ''راجہ'' زیادہ سمجھتا تھا کیونکہ وہ کسی حال میں بھی اپنی ناک پر مکھی بیٹھنے نہیں دیتے تھے۔

پہلی ہی صبح جی پی او کے وسیع و عریض ہال میں پہنچنے پر میں نے تقریباً سب ہی دفتری عملے کو سردی سے کانپتے ہوئے اپنی اپنی میز کُرسیوں سے چمٹے ہوئے پایا۔ لہذا جب دوپہر کو راولپنڈی سے اسسٹنٹ کنٹرولر رضوی صاحب نے آ کر نئے جواں سال پوسٹماسٹر سے اُسکے پہلے دن کے تجربے کے متعلق پوچھا تو میں نے سٹاف کی سردی کے ہاتھوں بنی ہوئی دُرگت کی داستان سُنا دی۔ بات اُنکی سمجھ میں فوراً آ گئی اور دوسری صبح ایک درجن بجلی کے ہیٹرز کی کھیپ جی۔پی۔او پہنچ گئی۔ سٹاف نے اس چھوٹی سی پیش رفت کا اچھا خاصا جشن منایا۔ سالوں بعد بھی اسلام آباد جی۔پی۔او کے کسی دیرینہ رفیق کار سے ملاقات ہوتی تو اُن حالات میں اُس نعمتِ غیر مترقبہ کے ملنے کا ذکر ضرور کرتا۔ یہ دور عالمی طاقتوں کے درمیان سرد جنگ کا گردانا جاتا تھا۔ جس کے نتیجے میں کئی بڑی اقوام آپس میں بٹی ہوئی تھیں۔ شمالی کوریا، جنوبی کوریا، شمالی ویٹ نام، جنوبی ویٹ نام، مشرقی جرمنی، مغربی جرمنی اور شمالی یمن، جنوبی یمن وغیرہ۔ ایک بھائی مغربی طاقتوں کا حامی تھا تو دوسرا کمیونسٹ مُلکوں کا کاسہ لیس شمار ہوتا تھا۔ ہمارے اسلام آباد جی۔پی۔او میں بھی ہر ایک سفارت خانے کا پوسٹ باکس جُدا تھا۔ یہاں تک تو خیریت تھی پر سفارتی ہنگامہ اُس وقت کھڑا ہو جاتا جب ہمارا نیم خواندہ عملہ بین الاقوامی سیاست کے رموز سے بے خبر اور بے نیاز دانستہ یا نادانستہ ایک سفارت خانے کا خط دوسرے کے پوسٹ بکس میں ڈال دیتا۔ کیونکہ اکثر قطعاتِ ڈاک پر پتے پر شمالی، جنوبی یا مشرقی، مغربی کی تخصیص نہیں ہوا کرتی تھی۔ لیکن اِلزامات کی جواب دہی کیلئے پوسٹماسٹر کی گردن حاضر ہوتی تھی۔

اُن دِنوں چونکہ دارالحکومت ہونے کے ناطے اسلام آباد ہمارے بنگالی بھائیوں سے بھی کافی آباد تھا اور گاہے بگاہے اُن کی طبع نازک پر پنجابی عملے کی ضرورت سے ذرا زیادہ پُر اعتماد ادائیں گراں گزر جاتیں اور پھر ڈاک خانے کا تعلق براہ راست ہر کس و ناکس سے ہوتا تھا لہذا چھوٹے موٹے تنازعات جنم لیتے۔ ایک صبح جوں ہی میں اپنی رہائش گاہ سے نیچے جی۔پی۔او کے بڑے ہال میں آیا تو سارے باوردی عملے کو اپنی میز کے قریب فراعنہ مصر کے زمانے کی ایک ممّی کے گرد حلقہ بنائے پایا۔ ابھی میں کوئی سوال نہیں کر پایا تھا کہ ایک لیڈر پوسٹمین آگے بڑھا اور اپنے ایک ساتھی کی کچھ بنگالی حضرات کے ہاتھوں بے رحمانہ پٹائی کی داستان سُنائی۔ پوسٹمین حضرت اپنی معمول کی تقسیمِ

ڈاک کے راؤنڈ پر تھا کہ ایک بنگالی بھائی سے کسی بات پر تو تُو مَیں مَیں ہوگئی اور بس بنگالی بھائیوں نے اُس کی اچھی خاصی دُرگت بنا دی۔ ابھی ابھی وہ پولی کلینک سے مرہم پٹی کرا کے اپنے ساتھیوں کے پاس پہنچا تھا۔ جی۔ پی۔ او اور تھانہ ساتھ ساتھ واقع ہیں۔ لہذا ہم سب نے جا کر تھانے میں رپَٹ لکھوا دی اور ممی کو عجائب گھر کی بجائے اُسکے اپنے گھر آرام کرنے بھجوا دیا۔ تھوڑی دیر بعد ہماری وزارت میں متعین ہمارے لائسان آفیسر اور اسسٹنٹ ڈائریکٹر جنرل فریدالدین احمد صاحب جی۔ پی۔ او تشریف لائے اور آتے ہی تقسیمِ ڈاک کے متعلقہ افراد سے پوچھ گچھ کرنے لگے۔ دراصل چونکہ فرید صاحب کا تعلق مشرقی پاکستان سے تھا لہذا بنگالیوں نے اُن سے شکایت کر دی تھی۔ اُنہیں جب تفصیلاتِ واقعہ سے آگاہی ہوئی تو بظاہر مطمئن ہو کر واپس چلے گئے۔

دارالحکومت سے متعلق اکثر دفاتر تو 1962ء سے اسلام آباد منتقل ہو چکے تھے۔ لیکن کئی ایک اداروں کے صدر دفاتر بہر حال ابھی تک کراچی میں کام کر رہے تھے۔ ان میں پاکستان پوسٹ آفس بھی شامل تھا۔ اسکے سربراہ یعنی ڈائریکٹر جنرل وقفہ وقفہ سے سرکاری امور نمٹانے اور وزارت مواصلات، وزارتِ مالی امور یا دیگر وزارتوں کے ساتھ مختلف اجلاسوں میں شرکت کیلئے اکثر و بیشتر بذریعہ ریل راولپنڈی/اسلام آباد آیا کرتے تھے۔ خواجہ عبدالرحمٰن (تمغہ قائداعظم) اچھے خاصے سخت گیر ڈائریکٹر جنرل مشہور تھے۔ اُنکی راولپنڈی آمد اور پھر روانگی دونوں مواقع پر پوسٹ آفس کے جملہ افسران جو اُن دنوں شہر میں تعینات ہوتے تھے۔ اُنکے استقبال اور رُخصتی کیلئے ریلوے سٹیشن پر حاضر ہوتے تھے اور خواجہ صاحب غیر حاضر افسران کے متعلق بطورِ خاص پوچھا کرتے تھے۔ لہذا ہمیں جب پہلی دفعہ اُنکی آمد کی اطلاع ہوئی تو بزرگ ساتھیوں نے بطورِ خاص وہی کچھ کرنے کو کہا جو وہ حضرات کیا کرتے تھے۔ اُن دنوں میرے ساتھ پوسٹ آفس میں ایک عدد نو وارد زیرِ تربیت خاتون افسر خالدہ ظفر بھی اسلام آباد جی۔ پی۔ او میں مرحلہ اول میں منسلک تھیں۔ اُسے بھی جب میں نے اس دستورِ شاہی سے آگاہ کیا تو وہ بھی استقبالیہ قطار میں کھڑے ہونے پر تیار ہوگئیں۔ خالدہ ایک ذہین اور شُستہ مزاج لڑکی تھی۔ وہ ایسا سب کچھ کرنے پر بضد ہوتی تھی جو اُسکے مرد رُفقاء کیا کرتے تھے۔ پوسٹ آفس ڈیپارٹمنٹ میں وہ مسز فاطمہ الیاس کے بعد پوسٹل سروس میں شامل ہونے والی دوسری خاتون افسر تھیں۔ اُن کی آمد سے اسلام آباد جی۔ پی۔ او کی رونق میں لامحالہ ایک خوشگوار اضافہ ہوا تھا۔ اگلی صبح ڈی جی صاحب جب جی۔ پی۔ او کے احاطے میں واقع ٹریننگ سنٹر میں تشریف لائے تو ہم دونوں کو بلوایا گیا اور خالدہ کو موقع پر ہی راولپنڈی

جی۔ پی۔ اور پورٹ کرنے کو کہا۔ اُنہیں اپنے صدر دفتر کی اس غلطی کا احساس ہو گیا تھا کہ ایک زیرِ تربیت افسر کو دوسرے زیرِ تربیت افسر کی شاگردی میں دینا چہ معنی دارد؟

خواجہ صاحب کسی بھی دفتر میں اچانک معائنے پر جاتے تو متعلقہ عملہ اور افسران کی معلومات اور حاضر جوابی کا امتحان شروع ہو جاتا۔ اُن کی خشمگین نگاہوں اور بارُعب آواز کے سامنے اچھے خاصے تجربہ کار حضرات کے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔ اُن کے سوالات کا جواب دینا گویا شماریات کا امتحانی پرچہ حل کرنا ہوتا تھا۔ اُن ہی دنوں وہ ریٹائر ہوئے تو راولپنڈی اور اسلام آباد کے افسران نے اُن کے اعزاز میں الوداعیہ دعوت دی۔ اُن کا اندازِ گفتگو بدستور ایک منجھے ہوئے ممتحن کا تھا۔ اختتامِ محفل پر ہر ایک سے ملے اور آخر میں مجھے ہاتھ ملانے کی سعادت بخشی تو میں نے بصد احترام عرض کیا کہ ہمیں یاد رکھئے گا۔ فرمایا، ''کیوں نہیں، کیوں نہیں؟''۔ ''تو پھر گاہے بگاہے خط بھیجتے رہئے''، میں نے کہا۔ ''بولے وہ کیوں؟'' ''تاکہ محکمے کی آمدن میں اضافہ ہوتا رہے''۔ میں نے جواب دیا۔ دراصل وہ ہمیشہ ایسی تاکید فرماتے رہتے تھے۔ اُنہوں نے جس انداز میں مجھے گھورا، لگ یہ رہا تھا کہ اُن کا بس چلے تو میری جان قبض کر لیں۔ لیکن حاضرین کے بعد میں تاثرات قابلِ شُنید تھے۔

آخری مرحلہ

پروبیشن کا آخری مرحلہ پوسٹل ٹریننگ سنٹر میں گزرتا تھا۔ لہذا تین ماہ کیلئے کراچی جانا ہوا۔ چونکہ میں اپنے بیچ کے ساتھیوں سے بعد میں پوسٹل سروس میں شامل ہوا تھا لہذا وہ سب اپنا سہ ماہی کورس ختم کر چکے تھے اور اس کورس کے سب شرکاء محکمانہ ترقی سے جونیئر کلاس وَن میں پہنچے تھے اور کافی بزرگ حضرات تھے۔ ان میں حسبِ معمول نصف تعداد مشرقی پاکستان سے اور دوسرے نصف مغربی پاکستان کے آفیسرز کی تھی۔ ہمارے پرنسپل نورالہدیٰ صاحب ایک حلیم الطبع انسان ہونے کے ساتھ ساتھ صحیح معنوں میں ایک علم دوست شخصیت تھے۔ سنٹر میں ہر رہائشی کمرے میں تین افراد کے ٹھہرنے کی گنجائش تھی۔ میرے دو ساتھی جمہوریہ جنوبی یمن کے دو افسر طے ہوئے۔ ایک کا تعلق عدن سے تھا جو قاہرہ (جمہوریہ مصر) سے تعلیم یافتہ تھا اور دوسرے حضر موت سے تعلق رکھتے تھے۔ دونوں کے عربی لہجے میں خاصا فرق تھا۔ ایک دن تو دونوں میں اچھی خاصی تکرار ہوئی جب میں نے عبدالعزیز (عدنی دوست) سے پوچھا کہ وہ ''یوم الجمعۃ'' کو ''یوم الگمہ'' کیوں بولتا ہے۔ وہ کہنے لگا کہ ''گیم'' ہی لفظ ''ج'' کا صحیح تلفظ ہے اور جمال عبدالناصر، گمال عبدالناصر ہے۔ حج تو ''الہگ'' اور ''جُمعہ'' ہے ہی ''الگُمہ''۔ اُسکا دوست عبدالعزیز کے سارے جدید عربی قاعدے تسلیم کرنے پر تیار تھا لیکن ''جیم'' کو ''گیم'' کہنے سے قاصر تھا۔